نیل کنول مسکائے

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اُردو، شمارہ : ۲۸۳
شعبۂ مطبوعاتِ کشمیر (۱)

نیل کنول مسکائے

مخمور حسین بدخشی

ادارۂ ادبیاتِ اُردو

بار ــــــــــــ اوّل
تعداد ــــــــــــ ۵۰۰
سن ــــــــــــ ۱۹۶۲ء
حُسنِ کار ــــــــــــ اندرابی
کتبہ ــــــــــــ واجدی
نور محمدی پریس

قیمت ــــــــــــ ڈھائی روپے

ادارۂ ادبیاتِ اُردو
خیریت آباد۔ حیدرآباد

اپنے راہنما ــــــــــــــ

ڈاکٹر سیّد محی الدین قادری زورؔ

ــــــــــــ کے نام!

ترتیب:

پیش لفظ

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

صدر شعبۂ اردو، ڈین آف فیکلٹیز
آف آرٹ اینڈ اورینٹل اسٹڈیز
جموں اینڈ کشمیر یونیورسٹی

معتمدِ اعزازی ادارۂ ادبیاتِ اردو،
ڈائریکٹر ابوالکلام آزاد اورینٹل انسٹیٹوٹ
حیدر آباد

کشمیر کے اُردو افسانے کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے اِس سرزمین میں یہ صنف ادب ۱۹۳۲ء سے روشناس ہوئی ہے۔ مگر جس سرعت کے ساتھ اِس میں ترقی ہو رہی ہے اور نئے نئے افسانہ نگار اُبھر رہے ہیں اور افسانے کی تکنیک کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چنار کے درختوں کی طرح کشمیر کے اُردو افسانے بھی اپنی بلندی، پہنائی اور افادیت میں دوسری اصنافِ سخن سے بہت جلد آگے بڑھ جائیں گے۔

اِس ملک کے اِبتدائی افسانہ نگار [illegible] پریم ناتھ پردیسی اور پریم ناتھ در کے نام یہاں کی ادبی تاریخ میں سرِفہرست [illegible] یا گئے۔ پردیسی کے مجموعے "شام و سحر" اور "بہتے چراغ" اور در کے "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں" ظاہر کرتے ہیں کہ اِن افسانہ نگاروں نے کشمیر اور اہلِ کشمیر کی حقیقی زندگی کی جھلکیں محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے نہ صرف جاگیردارانہ نظام پر چوٹیں کیں بلکہ فرسودہ سماجی بندھنوں کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ عوام کی اقتصادی بدحالی کی اِن دونوں نے اِس طرح ترجمانی کی ہے کہ ان کے افسانوں میں مقصدیت نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ دونوں اپنی کہانیوں کے کردار زیادہ تر ہانجیوں، مزدوروں اور کسانوں سے لیتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اُنہوں نے صحیح معنوں میں عوامی ادب کی تخلیق کی ہے۔ ان کے افسانوں سے واضح ہوتا ہے کہ اُنہوں نے

کشمیر کے رہنے بسنے والوں اور کشمیر کی بدلتی ہوئی سیاسی اور سماجی زندگی کی عمدہ عکاسی کی ہے۔

کشمیر کے دوسرے دَور کے افسانہ نگاروں میں تیج بہادر بھان اور پشکر ناتھ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے مجموعے "جہلم کے سینے پر" اور "اندھیرے اُجالے" شائع ہو چکے ہیں۔ اُنہوں نے ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ لکھنا شروع کیا ہے اور اب تک بڑی مستعدی اور جگر سوزی کے ساتھ مصروف ہیں۔ تیج بہادر اپنے پیش روؤں یعنی دونوں پریم ناتھوں کے راستے پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار بھی تقریباً اسی مظلوم حلقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ اور پشکر ناتھ دونوں فنی لوازم کا خاص خیال رکھتے ہیں اور ان کی معنی آفرینی سحر آفرینی کے حدود کو چھو لیتی ہے۔ خاص کر پشکر ناتھ اپنے افسانوں کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے جس غور و فکر اور محنت سے کام لیتے ہیں وہ قابلِ قدر ہے اور ان کی کامیابی کی ضامن ہیں۔

جدید دور کے اہم ترین افسانہ نگار حامدی کشمیری ہیں۔ یہ کشمیر کے جدید اُردو ادب کی رنگا رنگ شخصیت ہیں۔ وہ افسانہ نگار سے بڑھ کر شاعر ہیں اور شاعر سے بڑھ کر افسانہ نگار۔ اُن کے افسانے بھی شاعری کی طرح نوک پلک سے آراستہ اور شاعرانہ تیور سے معمور ہیں۔ چونکہ وہ پروفیسر بھی ہیں اس لیے اُن کے کرداروں اور تکنیک میں فلسفیانہ لب و لہجہ اور عالمانہ انداز نمایاں ہے۔ حامدی کا مجموعہ "وادی کے پھول" اِن ہی خصوصیات پر مبنی ہے۔

زمانۂ حاضر کے اُبھرتے ہوئے افسانہ نگاروں میں نور شاہ اور مخمور حسین بدخشی کے نام چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ نور شاہ کا مجموعہ "بے گھاٹ کی ناؤ"

اور مخمور حسین بدخشی کا مجموعہ "نیل کنول مُسکائے" کشمیر کے جدید ترین افسانوں کے اچھے نمونوں پر مشتمل ہیں۔

مخمور حسین سے میری ملاقات یوں تو ۱۹۵۸ء میں ہوئی تھی جب میں مولانا ابوالکلام آزاد سیمینار میں تقریر کرنے کے لئے کشمیر طلب کیا گیا تھا۔ لیکن اُن کو نزدیک سے دیکھنے کا موقع اسی سال ملا۔ ۴ ستمبر ۱۹۶۱ء کو اردو ایم۔ اے میں شرکت کے لئے ایک نوجوان میرے سامنے نمودار ہوا۔ میں نے انٹرویو میں جب اس کے عملی و ادبی شغل کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ یہ مخمور حسین ہیں اور افسانے لکھتے رہے ہیں۔ اور متعدد ادبی رسائل میں ان کے افسانے چھپتے بھی رہے ہیں۔ جب اُن کو ایم۔ اے میں داخلہ مل گیا اور وہ روز میری جماعتوں میں حاضر رہنے لگے تو اُن کی دلچسپ شخصیت اور ان کی ادبی صلاحیت نمایاں نظر آنے لگی۔ وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے ہیں اور اپنی شگفتہ مزاحیہ گفتگو سے خشک اور پژمردہ محفل کو بھی ہنسا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ میں اپنی کلاس کے لئے بطورِ مشق اپنے طالب علموں سے ہر ہفتے جو مضامین لکھاتا ہوں اُن میں مخمور حسین کے مضامین پڑھ کر مجھے اندازہ ہُوا کہ یہ بہت رواں لکھتے ہیں۔ اور ہر موضوع پر افسانوی اندازہیں انشاپردازی کرتے ہیں میں نے اُن سے خواہش کی کہ اپنے افسانے مجھے دکھائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے چند افسانے لا دیئے۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ اِن کی گفتگو اور اندازِ طبیعت کے خلاف اُن کے افسانوں میں مسکراہٹیں کم اور طنز کاری زیادہ ہے۔ اُنہوں نے ہنستے ہوئے چہروں سے زیادہ افسردہ دلوں کو پیش کیا ہے اور ہوس کاروں اور مکاروں پر بھرپور طنز کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمور حسین اپنی وادی کے انسانوں کو دیکھتے ہیں۔ اُن کے ساتھ چلتے پھرتے ہیں اور اُن کو پرکھنے کے بعد اپنے افسانوں میں جگہ دیتے ہیں۔ ان کے تمام کردار اسی آب و گِل کے پیداوار ہیں۔ اور اسی میں اُٹھتے بیٹھتے اور سانس لیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان میں تصنّع اور تکلّف نام کو بھی نہیں۔ ان کے افسانوں میں حقیقت اور صداقت کے گل بوٹے قدم قدم پر کھلتے نظر آتے ہیں۔ اِن کے یہ افسانے کسی نہ کسی حقیقت اور کسی نہ کسی راز کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ تکنیک کے لحاظ سے بھی یہ دل فریب ہیں۔ اور چوں کہ ایک اُبھرتے ہوئے فن کار کے موئے قلم کا نتیجہ ہیں، اس لئے اِن میں وہ گدرا پن ہے جو نئی نئی جوانی میں حسن بھر کر اُبھرتا ہے۔ وہ پختہ پن نہیں ہے جو عنفوانِ شباب کے بعد کسی ایسی حسینہ میں جھلکنے لگتا ہے۔ جس نے یہ محسوس کر لیا ہو کہ اس کے چاہنے والے اور اُس کے حسن کے قدردان پیدا ہو گئے ہیں۔

اِن باتوں کے پیشِ نظر میں نے محمور حسین بدخشی کے افسانوں کے مجموعے کو ادارۂ ادبیاتِ اُردو کی طرف سے چھاپنے کی سفارش کی اور مجھے یقین ہے کہ کشمیر کا یہ اُبھرتا ہوا فن کار اگر اسی طرح مصروفِ تخلیق رہے تو اُردو کے افسانوی ادب میں اپنا نام پیدا کر سکے گا۔ اور اپنے وطن کو تمام اُردو

پیش لفظ	نیل کنول مسکائے

دُنیا میں باعزت طریقے پہ روشناس کرنے کا باعث
بن سکے گا

۳۰ نومبر ۱۹۶۱ء

سیّد محی الدّین قادری نوؔر

اِنتظار

دور تک سائے ہی سائے تھے۔ مہیب اور تاریک سائے چاروں طرف ویرانی اور پریشانی کا جال سا نظر آرہا تھا۔ میں آکاش پہ اکیلے ٹمٹماتے ہوئے ستارے کو رہی تھی۔ اتنے میں کسی نے پتلے پتلے سے نازک نازک سے ہونٹ میرے گال سے لگا دئے۔ جیسے کوئی اوس سے بھیگا ہوا گلاب رکھ دیا۔ میں تھرتھرائی۔ کپکپائی، شرمائی اور جو گھبرا کر دیکھا تو تم تھے!۔ اُف یہ میں کیسے سپنے دیکھنے لگی ہوں۔ اِن اِن دنوں یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میں کچھ بھی تو نہیں سمجھ سکتی۔ پھر یہ سپنے مجھے پریشان کیوں کرتے ہیں۔ کیوں تڑپاتے ہیں۔ کیوں ترساتے ہیں۔ یہ اِن دنوں اک تم ہی میرے خوابوں میں کیوں چھائے ہوئے ہو۔ اور پھر مجھے ایک درد دے گئے ہو۔ ایک کڑوا سا درد۔ درد، جس میں آدمی چاہتا ہے کہ بس اب وہ مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ اُف کتنا موذی درد ہوتا ہے یہ بھی۔ آدمی مرتے مرتے جیتا ہے اور جیتے جیتے مرتا ہے لیکن نہ مرتا ہے نہ جیتا ہے۔ بس اِک کشمکش سی ہوتی ہے موت اور زیست کے درمیان۔ لیکن تم اِن سب باتوں سے بے نیاز ہو۔ بے خبر ہو۔ تمہیں کیا معلوم مجھ پہ کیا بیت رہی ہے۔ تمہیں کیا معلوم میں کھڑکی پہ لگے ہوئے پردے کی اوٹ میں سے کتنی بار تمہیں دیکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ اور پھر تمہیں دیکھنے کے بعد دل میں کیا کیا سوچتی ہوں۔ اپنے آپ کو کن کن باتوں سے تسلی دیتی ہوں۔ میں

تم سے باتیں بھی کرتی ہوں۔ بہت ساری باتیں۔ پیار کی باتیں۔ باتیں جو تمہیں بہت پسند آتی ہیں۔ تم سُنتے جاتے ہو اور میں کہتی جاتی ہوں۔ لیکن یہ سب کچھ میرے دِل میں ہی ہوتا ہے۔ میں اپنے دِل سے باتیں کرتی ہوں۔ تم بھی اِن باتوں کو میرے دِل میں ہی پسند کرتے ہو۔ لیکن ظاہر میں ایک بات بھی تمہارے کان تک نہیں پہنچتی۔

لیکن تم یہ نہ سمجھ لینا کہ میں بے وفا ہوں۔ یا مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں مِلنے کا کوئی موقع نہ دیا۔ ٹھیک ہے۔ تم نے میری طرف دیکھا اور میں کھڑکی سے پیچھے ہٹ آئی۔ یہ بھی سچ ہے۔ تم نے کچھ کہنا چاہا اور میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس دی۔ یہ سب کچھ درست ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بے وفا ہوں یا میرے دل میں تمہارے لئے کوئی محبت نہیں۔ خُدا کے لئے ایسا کبھی نہ سمجھ لینا کیوں کہ میرا دل کبھی بھی تمہاری یاد سے خالی نہ رہا۔ ایک پل کے لئے بھی نہیں۔ میں نے تمہیں دِل کی گہرائیوں سے پیار کیا ہے۔ میں نے تمہیں اپنے سینے میں چھپا لیا ہے میں نے تمہیں اپنی آنکھوں میں بسا لیا ہے۔

ابھی کچھ دیر پہلے میں کھڑکی میں آئی۔ پردہ ہٹایا اور تمہیں دیکھنے لگی۔ اور پھر بہت دیر تک دیکھتی ہی رہ گئی۔ تم اپنے چھوٹے بھائی کو گود میں لئے پیار کر رہے تھے۔ اُس کے پیارے پیارے گالوں کو چُوم رہے تھے۔ اور وہ اپنے ننھے مُنّھے ہاتھوں سے تمہارے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ پیار کا جواب پیار سے دیا جا رہا تھا۔ لیکن یہاں ہماری اس کوٹھی میں پیار کا جواب پیار سے نہیں دیا جاتا۔ پیار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں تو روپیہ ہی سب کچھ ہے۔ روپیہ ہی تو میرے ابا جان کی جان ہے

اور اُمّی کا دین و ایمان - اُمّی کبھی ابا سے پیار نہیں کرتی۔ سوائے اُس وقت جب وہ اُس کے لیئے کوئی قیمتی تحفہ لے آتے ہیں۔ نہیں تو وہ ہر وقت اُن سے کھچی کھچی ہی رہتی ہے۔ اور پھر ابا کو بھی کیا۔ اُنہیں تو کاروبار سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ پھر وہ کیوں اُمّی کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ جب چار روپیہ صرف کیا اور پیار مل گیا۔ افو کتنی ذلیل زندگی ہے ہماری بھی۔ سب جھوٹ اور کھوٹ ہے۔ پیار بھی کیا جاتا ہے تو روپے پیسے کے بدلے۔ سونے چاندی کی عوض۔ اُف ہو ایسی زندگی پہ۔ لیکن تمہارے ہاں ایسا نہیں ہوتا ہے آصف۔ تم کس قدر مسرّت کی زندگی گذارتے ہو۔ تمہارے ہاں کھوٹ نہیں، جھوٹ نہیں، لالچ نہیں، حرص نہیں۔ بس پیار ہے، خوشبو ہے مٹھاس ہے اور وہ سب کچھ ہے جو روح کی تازگی کا سبب بن جاتی ہے۔ تم اپنے چھوٹے بھائی سے پیار کر رہے تھے۔ اس پیار میں کوئی ملاوٹ نہیں تھی۔ کھوٹ نہیں تھی جھوٹ نہیں تھا۔ بس خالص پیار، بے غرض محبّت۔ میں اِس محبّت کو محسوس کر رہی تھی۔ میں چاہتی تھی کہ تم ہمیشہ اِس طرح اپنے چھوٹے بھائی سے پیار کرتے رہو اور میں دیکھتی رہوں۔ لیکن پھر تمہارے کرے میں تمہاری ماں آگئی۔ اُس نے پیار بھری نظروں سے تمہیں دیکھ کر تمہارے سامنے دُودھ کا گلاس رکھا۔ جیسے تم غٹاغٹ پی گئے۔ میں یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ کتنا پیار کرتی ہے تمہیں تمہاری ماں۔ اور کتنا پیار ہے تمہیں اپنی ماں سے۔ پھر تم نے کوئی کتاب اُٹھائی۔ یوں ہی دو چار ورق اُلٹ دیئے اور کتاب بند کی۔ پھر یکایک تم کھڑکی کے پاس آئے اور کھڑکی کے دونوں پٹ زور سے بند کئے۔ جانے اُس وقت کیوں میری آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ دِل کو ایک دھچکا سا لگا اور ذہن مفلوج سا ہو گیا۔ جانے مجھے ایسا کیوں ہوا آصف ۔ کیا

میں نے یہ محسوس کیا کہ تم نے کھڑکی صرف اس لئے بند کی کہ تم مجھے بے وفا سمجھنے لگ
گئے ہو۔ نہیں آصف۔ ایسی بات کبھی میرے ذہن میں نہیں آئی۔ اور نہ آ سکتی ہے
کیوں کہ میں بے وفا نہیں ہوں۔ اگر میں بے وفا ہوتی تو پھر وہ چھپ چھپ کے تمہیں
کیوں دیکھتی۔ تمہارے تصوّر میں پھولوں کو کیوں چومتی، تمہاری یاد کو دل کے گوشوں
میں کیوں بسا لیتی۔ میں بے وفا نہیں ہوں آصف۔ میں بے وفا نہیں ہوں۔ لیکن کہہ
اب اگر تم جذبات کی رو میں بہہ کر مجھے بے وفا سمجھنے لگو گے تو یہ مجھ پہ کتنا بڑا ظلم ہوگا۔
میں گھٹ گھٹ کے مر جاؤں گی۔ اپنے سینے میں خنجر بھونک دوں گی، ندی کی لہروں میں سمو
جاؤں گی۔ لیکن یہ ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ میں بے وفا نہیں ہوں آصف۔ البتہ مجبور
ضرور ہوں۔ اور پھر دنیا میں کوئی لڑکی بے وفا نہیں ہوتی مجبور ہوتی ہے۔ لیکن مرد
ہمیشہ جذبات کی رو میں بہہ کر عورت کو بے وفا کہتا ہے۔

مجھے ہی دیکھو آصف۔ میرے اِن بہتے ہوئے آنسوؤں کی طرف دیکھو۔ میری
آہوں کو تو سنو وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میرے زخمی دل سے تو پوچھو وہ کیوں رستا ہے۔
کل میری شادی ہو رہی ہے۔ شہنائیاں بجیں گی کوٹھی جگمگ جگمگ کرے گی۔ اِک نور
سا چاروں طرف بکھر جائے گا۔ لیکن کیا تم یہ سمجھتے ہو اس سے میرے مَن کا اندھیرا دور
ہو جائے گا۔ نہیں آنسو بہتے بہتے بہتے ہی جائیں گے اور دِل رستے رستے رستا ہی جائیگا
کیوں کہ یہ میری شادی نہیں ہو رہی ہے بلکہ میری دل کی دنیا ویران کرنے کے سامان
کئے جا رہے ہیں۔ ارے یہ میں کیا کہہ رہی ہوں تمہیں۔ میرے ہونے والے پتی تو ایک
اچھے خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ جب ہی تو میرے ابا مجھے اُن کے ہاتھوں سونپ کر خوشی
سے پھولے نہیں سماتے۔ وہ کہہ رہے تھے میرے ہونے والے پتی سو پشت سے خاندانی

بچھلے آرہے ہیں۔ پھر میں کیوں مری جا رہی ہوں۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیئے۔ اُن کے پاس ایک کار ہے۔ ایک بنگلہ ہے۔ لاکھوں کا بزنس ہے۔ اور زندگی کی وہ سب نعمتیں ہیں جن کی انسان آرزو کرتا ہے۔ پھر میں کیوں غم سے دوہری ہونے لگی ہوں۔ لیکن آصف یہ شادی تو میری آرزوؤں کا کفن ہے۔ میری حسرتوں کا جنازہ ہے۔ میری تمناؤں کی قبر ہے۔ تم نہیں سوچتے میرے ہونے والے پتی ایک اچھے خاندان کے چشم و چراغ ہونے کے علاوہ اور بھی کیا کچھ ہیں۔ اس سے پہلے بھی تو اُن کی منگنی ایک اور جگہ ہوئی تھی لیکن صرف اس وجہ سے منسوخ ہو گئی کہ ہیرے سے تارے کو وہاں سونے چاندی اور ہیرے جواہرات میں کمی نظر آئی تھی۔ اور چونکہ وہ ایک لڑکی سے شادی نہیں کر رہے تھے بلکہ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات سے۔ اس لئے نکاح منسوخ ہو گیا۔ لیکن اب تو ابا اُن کی آرزوئیں پوری کر رہے ہیں۔ وہ اُنہیں وہ سب کچھ دے رہے ہیں جس کا اُنہوں نے مطالبہ کیا ہے۔ اب تم ہی کہو آصف۔ یہ شادی ہے یا سودا بازی۔ جو مرد سونے چاندی سے شادی سے پیار کرے تم ہی کہو وہ بیوی کو کون سا پیار دے گا۔ وہ وہ پیار کہاں سے لائے گا جس کی ایک بیوی چاہت رکھتی ہے۔ کم از کم جس کی مجھے چاہ ہے۔ آہ میرے دل کو ایک دل کی چاہ ہے اور انہیں سونے چاندی کی چاہ! اُن کے پاس تو پہلے سے ہی سونے کے ڈھیر اور چاندی کے انبار تھے اور اب وہ ان ڈھیروں اور انباروں میں اضافہ کرنے کے لئے مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔ وہ مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔ سُنا تم نے آصف۔ وہ مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔ ابا کہہ رہے ہیں وہ مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔ اُمی کہہ رہی ہیں وہ مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔ دُنیا کہہ رہی ہے وہ مجھ سے شادی کر رہے ہیں۔ لیکن آصف میرا دل کہہ رہا ہے وہ مجھ سے نہیں سونے چاندی سے شادی کر رہے

ہیں۔ اور جو چاندی کے سکوں سے شادی کرتا ہے وہ ایک لڑکی سے شادی نہیں کرتا۔ اور جو ایک لڑکی سے شادی کرتا ہے وہ چاندی کے کھنکتے ہوئے سکوں سے شادی نہیں کرتا اور ہاں آصف میرے دیوتا تو اور بھی بہت ساری خوبیوں کے مالک ہیں۔ تم حیران ہوتے ہوگے کہ مجھے اپنے سرتاج کے متعلق یہ سب باتیں کیسے معلوم ہیں۔ مجھے کیوں معلوم نہ ہونے لگیں بھلا۔ وہ میرے دیوتا ہیں۔ میرے سرتاج ہیں۔ میرے مالک ہیں۔ پھر تم ہی بتاؤ مجھے اُن کی ایک ایک بات کیوں نہ معلوم ہو۔

تم نہیں جانتے میرے مالک کتنے نیک دل اور نیک خصلت ہیں۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں اُنہوں نے ایک لڑکی شاہینہ سے پیار کیا۔ اسے عمر بھر اپنانے کا وعدہ دیا۔ اُسے پیار بھرے خطوط لکھتے رہے۔ اور پھر شاہینہ بھی اُسے پوجنے لگی۔ اُس نے اپنا تن من اُس کے حوالے کیا۔ آنکھیں آنکھوں سے مل رہی تھیں۔ دل دل سے مل رہا تھا اور پیار اپنی پوری رفتار سے پروان چڑھ رہا تھا۔ لیکن پھر کچھ مدت بعد میرے سرتاج کو شاہینہ سے نفرت ہو گئی۔ اُنہوں نے اُس سے ملنا جلنا بالکل ترک کر دیا شاید اسی لئے کہ اُن کی نگاہیں کسی اور مہ جبین پہ ٹھہر گئی تھیں یا اُن کا دل اب شاہینہ سے کھیلتے کھیلتے بھر گیا تھا۔ پس وہ شاہینہ کے دل میں آگ لگا کر اُس سے الگ ہو گئے۔ وہ تڑپی، تلملائی، چلائی لیکن میرے دیوتا کے نرم و نازک دل پہ اس کی آہوں اور کراہوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور جب شاہینہ کو اِس بات کا یقین ہو گیا کہ اُس کا محبوب اُس سے ہمیشہ کے لئے روٹھ گیا ہے اور اب وہ کبھی اُس کے من مندر میں روشنی جلانے نہیں آئے گا تو وہ تھک ہار کر بیٹھ گئی۔ آخر ایک روز شاہینہ کے ہاتھ پیلے کئے گئے۔ وہ ڈولی میں سوار ہوئی اور کسی کی ہو گئی۔ لیکن میرے دیوتا یہ کیسے برداشت

کر سکتے تھے۔ شاہینہ نے تو اُن کی محبت کا مذاق اُڑایا تھا۔ اُسے تو چاہیئے تھا کہ وہ اُن کی یاد میں ہی گھٹ گھٹ کے مر جاتی۔ کچھ کھا کے مر جاتی، کسی اندھیرے کنویں میں کود جاتی لیکن شادی نہ کرتی۔ کیوں کہ اِس طرح میرے پتی دیوتا کی محبت کا خون ہُوا۔ اب میرے مالک کی رگوں میں خاندانی خون کھولنے لگا۔ کچھ مُدت بعد اُنہوں نے پھر سے شاہینہ سے میل مِلاپ بڑھایا۔ اُسے اُس کی غلط فہمی کا احساس دلایا۔ اُس کے قدموں پہ اپنا دِل رکھ دیا۔ اُس کے کانوں میں پیار کا رس گھول دیا۔ اُسے یقین دلایا کہ وہ اُس کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر اُس نے اُس کے ساتھ شادی نہیں کی تو وہ اُسے ایک دِن کسی موٹر کے پہیئے کے تلے کچلا ہُوا پائے گی۔ کیونکہ میرے پتی دیوتا کو اُن سے محبت ہے۔ ایک معصوم لڑکی ایک بار پھر اُن کے پیار کے جال میں پھنس گئی۔ اُن کے وعدے پہ اعتبار کر بیٹھی۔ اور پھر ایک دِن ایسا بھی آیا جب شاہینہ نے اپنے محبوب کی خاطر ایک بہت بڑی قربانی دی اور طلاق حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اب میرے سرتاج خوش تھے۔ اُن کے دل کی مُراد جو بھر آئی تھی۔ ایک معصوم لڑکی کا اِنتقام لینے میں جو سُرخ روئی حاصل ہوئی تھی۔ شاہینہ بھی خوش تھی۔ اپنا روٹھا ہُوا محبوب جو مِل گیا تھا۔ کھویا ہُوا پریتم جو واپس آ گیا تھا۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتی۔ وہ آئی اور اپنے محبوب کے قدموں پہ گر پڑی۔ اُسے اپنا وعدہ یاد دِلایا۔ اُس سے پیار سے شادی کی درخواست کی۔ لیکن اب میرے پتی دیوتا کو پھر سے شاہینہ سے نفرت ہو گئی۔ اُنہوں نے ایک بار پھر اُسے ٹھکرا دیا۔ ایک بار پھر اُس کے پیار کے خرمن میں آگ لگا کر راکھ میں بدل دیا۔ یہ ہیں میرے سرتاج آصف۔ میرے مالِک۔ میری قسمت کے خریدار یہ ہیں اُن کے نزدیک پیار کی قیمت اور یہ ہے اُن کے نزدیک محبت کا صِلہ۔ پیار کر کے

ٹھکرانا اور پھر ٹھوکر پہ ایسی ٹھوکر لگانا کہ پھر آدمی سنبھالے نہ سنبھل سکے۔!
یہ ہیں میرے پتی دیوتا آصف! اور کیا تم سمجھتے ہو میں اُن کے ہاں جاکر
خوش رہ سکوں گی۔ کبھی بھی نہیں۔ لیکن میرے ابا سمجھتے ہیں کہ میں اُن کے ہاں جاکر
بڑی چین زندگی بسر کروں گی۔ اُمی کہتی ہے میں وہاں لاکھوں میں کھیلوں گی۔ عزیز
و اقارب کا خیال ہے وہاں میری ایک ایک خواہش کی تکمیل ہوگی۔ لیکن آصف! کیا تم بھی
ایسا ہی سمجھتے ہو۔ کیا تم بھی میری حسرتوں کا جنازہ نکلتے دیکھ کر کہہ سکو گے کہ میں کلی کی
طرح مسکرا رہی ہوں۔ مجھے آگ کی لپٹوں میں جلتے دیکھ کر یہ سمجھو گے کہ میں پھولوں کی
سیج پر زندگی بسر کر رہی ہوں۔ غم کے بھنور میں میری زندگی کی ناؤ کو ہچکولے کھاتے
دیکھ کر کیا تم بھی یہی تصوّر کرو گے کہ میں خوشی کے جھولے میں جھول رہی ہوں۔ نہیں،
آصف! میرا پیار تمہیں ایسا سوچنے نہیں دے گا۔ وہ تمہیں میرے آنسوں کے ساتھ
دو آنسوں بہانے پر مجبور کرے گا۔ کیونکہ میں نے تمہیں پیار ہی نہیں کیا ہے بلکہ پوجا
ہے۔ اور جو پوجنے میں طاقت ہے وہ دُنیا کی کسی طاقت ورسے طاقت ور شے میں نہیں ہے
یہ جو جاذِل کے گوشوں میں پروان چڑھی ہوئی طاقت ہے جو عرش تک کو ہلا سکتی ہے۔ فرش
تک کا سینہ چاک کر سکتی ہے۔ اور دُنیا کی سنگ دل سے سنگ دل شے کو موم بنا سکتی ہے۔
پھر بھلا بتاؤ وہ تمہارے دل میں رحم کیوں نہ ڈالے۔! اور دیکھو اس وقت مجھے
تمہارے رحم کی کتنی ضرورت ہے۔ تمہارے پیار کی کتنی حاجت ہے۔ کیونکہ میں بے کس ہوں
بے بس ہوں، مجبور ہوں۔ ایک طرف تمہاری بے لوث محبت ہے۔ دوسری طرف سونے
چاندی کے سکّے۔ یہ سکّے مجھے خریدنے جیت رہے ہیں اور محبت ہار رہی ہے۔ کاش! یہ
جیت ہار میں اور ہار جیت میں بدل جاتی۔ کاش کچھ ہوتا! لیکن کچھ بھی تو نہ ہوگا آصف!

کیوں کہ دُنیا اندھی ہے اور میں مجبور۔ دُنیا کو سونے چاندی کی چمک نے اندھا کیا ہے اور میں مجبور ہوں شرم و حیا کی وجہ سے۔ میں آہ تک نہیں کر سکتی۔ میں اپنا دِل کسی کے سامنے نہیں کھول سکتی۔ کیوں کہ میں جانتی ہوں میرے زخمی دل پر مرہم رکھنے والا کوئی بھی نہیں۔ میرے آنسوں پونچھنے والا کوئی نہیں۔ میری تباہی اور بربادی کا حال دیکھنے والا کوئی نہیں۔ کیونکہ دُنیا اندھی ہے۔ وہ جو کچھ کرتی ہے اندھا دھند کرتی ہے۔ جو کچھ دیکھتی ہے اندھے نقطۂ نظر سے دیکھتی ہے۔ اب تم ہی کہو میں کس سے کہوں جب سُننے والا ہی کوئی نہ ہو۔ میری زبان پر تالے لگائے گئے ہیں۔ اسی لیے میں اِس اندھی دنیا سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ وہ آنکھوں والے کی بات سُن کر بہری بھی بن جاتی ہے۔ میں اپنے ابا اور اُمّی سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے اُس وقت میرے ہونٹ آگ میں تپے ہوئے سرخ سرخ سلاخوں سے داغ دئے جائیں گے۔ کیوں کہ جب ایک عورت سماج کے بنائے ہوئے قوانین کو ٹھکراتی ہے تو سماج کی نظروں میں وہ نیچ تصوّر کی جاتی ہے۔ جب وہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف آواز اُٹھاتی ہے۔ اُس وقت بے شرم قرار دی جاتی ہے۔ اور اب آصف تم کیوں بھولتے ہو کہ میں بھی اُسی سماج کی ایک فرد ہوں۔ اُسی دُنیا کی ایک عورت ہوں۔ ایک بے بس اور مجبور عورت۔ جو دل کی بات ہونٹوں پر نہیں لاسکتی۔ جو گھٹ گھٹ کر مر سکتی ہے مگر فریاد نہیں کر سکتی!

آصف پیارے! اُف میں تمہیں پیارے کہہ گئی۔ خیر جانے دو۔ ہاں تو آصف کل یہاں تم ہماری کوٹھی سے شہنائیوں کی آواز سُنو گے۔ راگ و رنگ کی محفلیں سجتے دیکھو گے اور مجھے کسی اور کے گھر جاتے ہوئے دیکھ پاؤ گے۔ لیکن تم اس وقت

یہ نہ سمجھ لینا کہ بس میں اس گھر سے تمہاری یاد دل سے نکال کر چلی گئی۔ تم سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ کر چلی گئی۔ نہیں آصف! ایسا کبھی نہ ہو گا۔ تم ایسا کبھی نہ سمجھ لینا۔ اس گھر کو الوداع کہتے وقت تیری یاد میرے دل میں محفوظ ہو گی۔ اس میں کوئی کمی نہ آئی ہو گی۔ کیونکہ سچی لگن میں کبھی کوئی کمی نہیں آتی بلکہ یہ بڑھتے بڑھتے بڑھتے ہی چلی جاتی ہے۔ لیکن تم مجھے اپنے دل سے نکال نہ دینا۔ تم مجھے بے وفا سمجھ کر ٹھکرا نہ دینا۔ تم میرا انتظار کرنا نہ چھوڑ دینا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہے ایک دن میں تمہارے قدموں میں آ جاؤں گی۔ اُف! میں اس وقت کے تصور سے تھر تھر کانپ رہی ہوں۔ خدا نہ کرے ایسا دن بھی مجھے دیکھنا پڑے۔ لیکن میں حقیقت سے کیسے منہ موڑ سکتی ہوں۔ ہونی انہونی میں کیسے بدل سکتی ہے۔ سونے چاندی سے پیار کرنے والا مرد مجھ سے کیوں پیار کرنے لگا۔ ایک معصوم لڑکی کے پیار کو ٹھکرانے والا مرد مجھے کیوں تھامنے لگا۔ وہ ایک دن مجھ سے بھی کھیلتے کھیلتے تنگ آ جائے گا اور پھر مجھے ایک فضول سی شے سمجھ کر کسی کھڑکی سے باہر پھینک دے گا! لیکن آصف! اس وقت تک میں تمہاری آس کے سہارے جیتی رہوں گی۔ اور پھر جب یہ سب کچھ ہو گا میں تمہارے قدموں پر گر پڑوں گی۔ تمہیں اپنے بے لوث پیار کا واسطہ دوں گی۔ تمہیں اپنی مجبوریوں کا احساس دوں گی۔ اُس وقت تم مجھے ٹھکرا نہ دینا۔ میری آشاؤں میں آگ نہ لگا دینا۔ میری تمناؤں کا خون نہ کرنا۔ کیوں کہ اُس وقت میں بہت دکھی ہوں گی۔ یہ اندھی دنیا اُس وقت مجھ سے کوئی ہمدردی نہ کرے گی لیکن تم اپنے رحم کے دروازے مجھ پر بند نہ کر دینا ہر ایک مجھ سے نفرت کرے گا لیکن تم مجھ سے منہ نہ موڑ لینا۔ میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ اب تم میرا انتظار کرنا نہ بھول جانا۔ جب دور تک سائے ہی سائے پھیل

جائیں گے۔ جب چاروں طرف ویرانی اور پریشانی کا جال بچھ جائے گا۔ جب ایک تند اور تیز آندھی چلے گی، درختوں کے جڑ ہلنے لگیں گے۔ زمین ہلنے لگے اور میں گرنے لگوں اُس وقت تم آنا اور مجھے تھام لینا۔ کیونکہ میں تمہارا ہی انتظار کرتی ہوں گی!!

اُف یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ یہ تم بار بار میرے تصورات پر کیوں چھا رہی ہو۔ مجھے نیند کیوں نہیں آتی۔ نیند جو انسان کے ہر دُکھ درد کا مداوا ہے۔ چلی جاؤ۔ میری آنکھوں سے ہٹ جاؤ اور مجھے سونے دو۔ رات بھی تو اب کافی ڈھل چکی ہے۔ میں اپنے کان بند کئے دیتا ہوں تاکہ تیری آہٹ تک نہ سُن سکوں۔ مگر یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ کانوں میں انگلیاں ٹھونس دینے کے باوجود یہ تمہاری آواز کہاں سے آرہی ہے۔ آنکھیں بند کرنے کے باوجود تمہیں کیوں دیکھ رہا ہوں۔ اُف! کیا مجھے نیند اب کبھی بھی نہ آئے گی۔ جب سے میں نے تمہاری صورت دیکھی ہے۔ تم میری آنکھوں میں بس گئی ہو۔ میرے دل میں سما گئی ہو۔ اور جب سے میں نے تمہاری باتیں سُنی ہیں۔ اُن ہی باتوں کو بار بار یاد کرتا ہوں۔ نہیں میں نے غلط کہا۔ میں اُن باتوں کو کہاں یاد کرتا ہوں۔ وہ تو خود بخود یاد آجاتی ہیں جیسے تم ابھی میرے سامنے بول رہی ہو!

"آپ بڑے ضدی ہیں"

"لیکن جب تک تم مجھے اپنے متعلق سب کچھ نہ بتاؤ گی۔ میں یہاں سے نہیں اُٹھوں گا"

"آپ ضد کیوں کر رہے ہیں؟"

"اس لئے کہ میں ضدی ہوں"

"آپ بڑے ـــــ"

"جی ہاں میں دُنیا کا سب سے بڑا بیوقوف ہوں۔ پاگل ہوں جو دو گھنٹے سے یہاں بیٹھا تمہارا وقت ضائع کر رہا ہے۔ یہ لو میں چلا"
اور جب میں جانے کے لیئے اُٹھا ہی ہوں تمہاری ترنم آواز کمرے میں ساز بجانے لگتی ہے
"ٹھہریئے! سُنیئے تو!"
میں رُک گیا ہوں۔
"آپ رُوٹھ گئے؟ آخر آپ بھی مجھ سے رُوٹھ کر جا رہے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ جس سے قسمت رُوٹھ جاتی ہے پھر غیر تو کیا اپنے بھی اُس سے مُنہ موڑ لیتے ہیں"۔
میں تمہاری طرف دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری نرگسی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ کر تمہاری اُجلی اُجلی ساڑی میں جذب ہو رہے ہیں۔
"یہ تم رو رہی ہو؟"
تم کوئی جواب نہیں دیتی ہو۔ صرف تمہاری معصومیت میں ڈوبی آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں اور موتی لٹا رہی ہیں۔
"میں تم سے روٹھ نہیں گیا مریم۔ تمہاری اِن نرگسی آنکھوں کی قسم۔ میں تم سے رُوٹھ نہیں گیا"
تم اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہو اور میرا دل چھلنی ہو رہا ہے۔
"اُف خدا کے لیئے اپنے آنسوؤں کو روکو مریم۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں تم سے روٹھ کر نہیں جا رہا تھا۔ بلکہ۔"
"آپ مذاق کر رہے تھے"
"جی"

"بڑے بھولے لگتے ہیں آپ بھی"

تم بڑی معصومیت کے ساتھ اپنے رومال میں اپنی خوبصورت آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کو جذب کر رہی ہو۔ اُف تمہاری اس معصومیت نے تو مجھے تمہارے قریب کر دیا ہے۔ تم سر تا پا معصوم ہو۔ ایک نو زائیدہ بچے کی طرح۔ گلاب کی ایک کلی کے مانند۔ اور تم بھی تو ایک کلی ہی ہو۔ انیس سال کی عمر کوئی زیادہ تو نہیں ہوتی۔ مگر تم تو انیس سے بھی کم دکھائی دیتی ہو۔ یہی کوئی پندرہ سال کی۔

اب تم نے اپنا سر میرے قریب کر دیا ہے۔

"بس اب آپ خوش ہو گئے نا۔؟"

تم ہلکے سے مسکرا رہی ہو اور تمہارا چہرہ ایسا لگ رہا ہے جیسے شبنم نے گلاب کا چہرہ اپنے پاکیزہ ہاتھوں سے دھو ڈالا ہو۔

"ہاں اب ٹھیک ہے"

اب میں تمہارے پلنگ کے بالکل قریب آ گیا ہوں۔ اس قدر قریب کہ تمہاری سانس کے اتار چڑھاؤ کو اچھی طرح سن پاؤں۔ میری آنکھیں تمہارے چہرے سے نہیں ہٹتی ہیں اور نہیں ہٹانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تمہیں دیکھتے دیکھتے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے تمہیں دس پندرہ برس پہلے کہیں کھو دیا تھا اور اب اچانک پا لیا ہو۔

"اُن دنوں میں پندرہ سال کی تھی"

تم کہہ رہی ہو اور میں تمہاری آنکھوں کی نیلاہٹ میں کھو رہا ہوں۔

"وہ دن بھی کیسے دن تھے۔ کاش وہ دن پلٹ کے آ جاتے۔ لیکن گزرے ہوئے لمحات کب پلٹ کے آ جاتے ہیں۔ جانے والے بھی کبھی واپس نہیں آتے۔ جانے والوں کی صرف یاد

نیل کنول مسکائے

مریم

آج بھی مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب میں سکول سے نکلی تو سامنے سے بس آ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ رک گئی۔ اسی وقت ایک اکیس بائیس سال کے درمیان ایک نوجوان میرے قریب آ گیا۔ میں بس میں چڑھی تو وہ بھی میرے پیچھے بس میں سوار ہوا میں نے بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں پہ ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تو وہاں کوئی بھی سیٹ خالی نہ تھی۔ میں ابھی کھڑی ہی تھی کہ کوئی ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور مجھ سے مخاطب ہوا

"آپ تشریف رکھئے"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کی جگہ بیٹھ گئی۔ اسی وقت وہ لڑکا جو کہ میرے ہی ساتھ بس میں سوار ہوا تھا میرے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔ کنڈکٹر ہاتھ میں دو ٹکٹیں تھام کر اس سے مخاطب ہوا

"بھائی صاحب ٹکٹ۔ ایک انہیں دے دیجئے اور ایک آپ"

اس لڑکے نے دونوں ٹکٹیں کنڈکٹر کے ہاتھ سے لیکر اپنی پتلون کی دائیں طرف کی جیب میں ڈال دیئے اور کنڈکٹر کو پانچ آنے پیسے دیئے۔ میں ٹھٹھک کر رہ گئی۔ عجیب سی حالت ہوئی میری۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ میں نے برقعے کی نقاب سے آنکھیں ذرا اوپر کر اٹھائیں۔ وہ لڑکا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور دھیمی دھیمی لے میں کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے یک دم سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہاں سے ایک ٹکٹ نکال کر کچھ کہے بغیر میری طرف بڑھا دیا۔ میں جیب سے پیسے نکالنے ہی لگی تھی کہ اس نے میرے ہاتھ میں ٹکٹ دینے کی بجائے میرے برقعے پہ رکھا اور خود بے پروائی سے دوسری طرف دیکھنے لگ گیا۔ میں حیران یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ دو تین منٹ گزرنے کے بعد جب اس نے پھر

میری طرف مسکرا کر دیکھا تو میں نے اُس کے ہاتھ میں ایک روپیہ کا نوٹ دے دیا جو اُس نے مسکرا کر لیا اور کنڈکٹر کی طرف بڑھا دیا۔

"چینج" وہ بولا۔

کنڈکٹر نے اپنے بیگ سے سولہ آنے نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اُس نے گن لیے اور پھر میرے ہاتھ میں تھما دیئے۔ میں نقاب کے اندر ہی سے جو گننے لگی تو سولہ آنے برابر۔ اب تو میری روح تڑپ گئی۔ اس کی طرف پھر ایک بار جو دیکھا تو وہ اب بھی مجھے دیکھ دیکھ کے مسکرا رہا تھا۔ پہلے میرے جی میں آیا کہ میں اپنے ٹکٹ کے سولہ آنے پیسے اُسے واپس کر دوں۔ لیکن پھر سوچا بس میں بیٹھے ہوئے جو لوگ ہیں وہ کیا سمجھیں گے یہ لیلیٰ مجنوں کا ناٹک کھیل رہے ہیں۔ کنڈکٹر کا دونوں ٹکٹ آتے دے دینا۔ اُس کا میرے بھی پیسے ادا کرنا۔ پھر میرا ایک روپیہ اس کے ہاتھ دینا۔ اُس کا کنڈکٹر سے چینج لینا اور پھر پورے سولہ آنے مجھے واپس کرنا۔ اور اب اگر میں پھر سولہ نئے پیسے اسے دے دیتی تو یہ بات نہیں بس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو نہ جانے کیا کیا سوچنے پہ مجبور کرتی۔ یا میری آبرو پر شک کیا جاتا یا اُس کی شامت آ جاتی۔ جسے بس سے بے آبرو ہو کر اُترنا پڑتا جو میں نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ چہرے مہرے سے ایک شریف صورت لڑکا دکھائی دیتا تھا۔ بس ایک جھٹکے کے ساتھ ڈل گیٹ پہ رُک گئی۔ میرا مکان بس اب دس بیس قدم آگے تھا۔ میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور بس سے نیچے اُتر کر برقعے کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔ میں نے دیکھا وہ لڑکا بھی بس سے اُتر گیا ہے۔ اور میری طرف دیکھ دیکھ کے مسکرا رہا ہے۔ میں چلنے لگی تو وہ میرے آگے آگے آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ مُڑ مُڑ کے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں میرا مکان نزدیک آ گیا۔ دروازے پہ آ کر میں نے مُڑ کر جو اُس کی

طرف ایک نظر دیکھا تو وہ سڑک پر کھڑا اب بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں جلدی جلدی اندر چلی آئی۔ اور پھر مجھے خبر نہیں وہ وہاں سے کب چلا تھا۔"

"اپنے کمرے میں پہنچ کر میں دم بھالنے لگی اور پھر عجیب عجیب سے خیالات ذہن میں آنے لگے۔ بار بار اُس کی صورت آنکھوں پر چھا جاتی۔ گو اُس نے ایک بات بھی مجھ سے نہ کی تھی۔ لیکن نہ جانے مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اُس نے مجھ سے بہت کچھ کہہ دیا ہو۔ اپنی آنکھوں کی زبانی۔ سچ ہے انسان کسی کی زبان پر شک کر سکتا ہے لیکن کسی کی آنکھوں پر شک نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آنکھوں کی زبان جھوٹ نہیں بولتی۔ آنکھوں میں ایک انسان کا دل جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اُس کے جذبات مچلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اُس کی سیرت اور اُس کا حقیقی عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ بہت ہی شریف صورت لڑکا تھا پھر اُس رات بہت دیر کے بعد میری آنکھ لگ گئی۔ اور صبح جو اُٹھی تو دیکھا اُس کی تصویر ابھی تک میرے ذہن سے نہیں مٹی ہے۔ "میں بھی کسی قدر پاگل ہو گئی ہوں۔" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ کسی کی صورت ہی دیکھی اور لگی اُسے یاد کرنے۔ جانے وہ کون تھا۔ کس قسم کا تھا۔ کیا نام تھا۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں معلوم۔ پھر مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ اُس کے متعلق سوچوں؟" میں اُسے بھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اور میں اُسے بھول گئی۔ گھر کے شور میں۔ ریڈیو کی دھنوں میں۔ سکول کے کام میں۔ میں نے اُردو کی کتاب اُٹھائی۔ نظم پورشن میں غالب کی غزلیں تھیں۔ ایک غزل لی اور اُس کی تشریح کرنے لگی۔ ایک شعر نے دماغ میں تلاطم مچا دیا۔ "کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک" میں نے لاکھ سر پھوڑا لیکن معنی سمجھ میں نہ آئے۔ اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔۔۔

"یس پلیز"

"از اٹ 555"

"یس اِٹ اِز 555"

"آپ کون بول رہی ہیں؟"

"آپ کِن سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"زیدی صاحب گھر میں ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ آفس چلے گئے ہیں۔"

"واپس کس وقت آتے ہیں؟"

"سات بجے سے پہلے نہیں۔"

"کیا آپ زیدی صاحب کی بیٹی بول رہی ہیں؟"

"جی"

"وہی جو کل چار بج کر پینتیس منٹ پہ لال چوک سے بس پہ آئی تھیں؟"

"جی ہاں وہی تو ہوں۔ لیکن آپ کون ہیں؟"

"کیا آپ مجھے پہچانتی نہیں ہیں؟"

"نہیں تو۔ کون ہیں آپ۔؟"

"کیا آپ کو یاد ہے کل جب آپ بس پر سوار ہوئی تھیں تو آپ کے قریب ہی کوئی کھڑا تھا۔"

"جی وہاں تو بہت سارے آدمی کھڑے تھے۔ اب میں کس کس کو یاد رکھتی"

"کیا آپ کو یاد ہے آپ کے ہاتھ میں ٹکٹ کس نے دیا تھا؟"

"دیا تو تھا کسی نے"
"کیا آپ کو یاد ہے ایک روپیہ آپ نے کس کے ہاتھ دیا تھا۔"
"کسی کے ہاتھ دیا تھا"
"کیا آپ کو یاد ہے برابر سولہ آنے آپ کو کس نے دیئے تھے۔؟"
"ہاں دیئے تو تھے کسی نے۔ لیکن میں اُس کی صورت یاد نہ رکھ سکی۔ لیکن آپ بتائیے نا آپ کون ہیں۔؟"
"میں وہی ہوں جس کی صورت آپ یاد نہ رکھ سکیں۔"
"کیا میں آپ کا نمبر پوچھ سکتی ہوں؟"
"وہ ڈائریکٹری میں دیکھ لیجئے۔"
"آپ کا نام؟"
"وہ بھی ڈائریکٹری میں موجود ہے"
"آپ تو عجیب بات کہتے ہیں۔ بتائیے نا نام"
"منظور"
"پورا نام بتائیے نا"
"مجھے صرف منظور کہتے ہیں"
"آپ کہاں رہتے ہیں؟"
"یہ کسی اور وقت بتا دوں گا"
"اُف آپ بھی تو عجیب آدمی ہیں۔ اچھا نمبر ہی بتا دیجئے۔"
"اُس کے بتانے کا بھی وقت آئے گا۔"

"بتائیے نا؟"

"کسی اور وقت بتا دوں گا"

"آپ بھی بڑے ضدی ہیں"

"آپ بھی کچھ کم شوخ نہیں۔ آپ کی میٹھی سی آواز سُن کر تو دِل چاہتا ہے کہ ابھی سب کچھ بتا دوں لیکن ــــ"

"بتائیے نا اب"

"نہیں کسی اور وقت سب کچھ بتا دوں گا"

"اچھا تو پھر نہیں بتائیں گے آپ؟"

"نہیں"

"نہیں بتائیں گے؟"

"نہیں"

"نہیں بتائیں گے؟"

"نہیں"

"اچھا آداب عرض"

"آداب عرض"

"یہ تھی منظور سے میری دوسری مُلاقات۔ اور پھر روز صبح کو ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی۔ ایک دن ٹیلیفون پر ہی اُس نے مجھے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ پھر ٹیلیفون کو چھوڑ کر ہم ایک دوسرے سے کہاں کہاں ملے۔ کِس طرح خطوط کا سِلسلہ چلا۔ کیا کیا عہد و پیماں ہوتے اور پھر کِس طرح ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ رِشتہ بندھ گیا؟ یہ ایک

مریم

طویل داستان ہے۔ جس کے سننے کے لئے نہ ہی آپ کے پاس وقت ہے اور نہ میں ہی اسے بیان کر سکتی ہوں۔ کیونکہ یہ جذبات کی بات ہے۔ اُس کے جذبات اور میرے جذبات۔ لیکن تھا یہ عطر میں ڈوبے ہوئے لمحات کا عالم۔ جس عالم میں ہم دونوں کھو گئے تھے۔ اور یہی میری آرزو تھی۔ لیکن میں کتنی پاگل ہوگئی تھی۔ جو یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ میری آرزو پوری ہوگئی ہے۔"

"کیونکہ ایک دن وہ بھی آیا۔ جب منظور کا ایف۔ ایس۔ سی کا نتیجہ نکلا اور وہ فیل ہوگیا۔ اور پھر وہ بغیر کسی سے پوچھے پاکستان بھاگ گیا۔ اور اب تک لوٹ کے نہیں آیا۔ ہم نے پاکستان خطوط بھیجے لیکن اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ اس دوران میں مجھ پہ کیا بیتی؛ اسے بھی بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین تھا وہ مجھے خط لکھے گا۔ لیکن اُس نے کبھی بھولے سے بھی خط نہ لکھا۔ مجھے یقین تھا وہ ایک دن ضرور آئیگا لیکن وہ نہ آیا۔ ایک سال دو سال اور پھر تیسرے سال ابا خود پاکستان گئے تو وہاں اُنہیں پتہ چلا کہ منظور نے کراچی میں ایک موٹر کمپنی میں ملازمت اختیار کی ہے۔ اور پھر ایک خاتون سے شادی بھی کی ہے جس سے اس کا ایک بچہ بھی ہوا ہے۔ اور پھر ابا بغیر اُس سے ملے واپس آگئے۔ میں نے جب سُنا تو مجھ پر برق سی گر پڑی۔ اور پھر اُس دن سے میں میں نہ رہی۔ خوشیاں تو پہلے سے ہی ساتھ چھوڑ چکی تھیں۔ اب امید کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ پھر میں اندر ہی اندر کسی نامعلوم آگ میں جلتی رہی۔ اس آگ نے میرا تن بدن بھسم کر ڈالا۔ میری روح کو خاکستر کیا۔ اس دوران میں کئی اچھے گھرانوں سے پیغامات بھی آئے۔ امی ابا اور دوسرے سبھوں نے مجبور کیا۔ لیکن میں نہ مانی۔ کیونکہ میں نے جسے چاہا تھا۔ میں نے جس کے قدموں میں اپنا سر ڈال دیا تھا۔ میں نے جس نے

پیار گیا تھا۔ جب وہی میرا نہ رہا تو اب دوبارہ کسی اور کے متعلق کیا سوچ سکتی تھی۔۔ میرے پاس اب تھا ہی کیا جو کسی کے حوالے کرتی۔۔ نہ جسم کی رنگت نہ دل کا پیار۔۔ اور پھر ایک دن وہ بھی آیا جب ڈاکٹر نے کہا کہ مجھے ٹی۔بی ہو گئی ہے۔۔ اس دن یقیناً میں بہت خوش ہو گئی۔۔ بہت بہت خوش۔ کیونکہ آخر موت کو تو میری حالت پر ترس آ ہی گیا تھا۔ میں مر جانا چاہتی تھی۔ میں اس دنیا سے ایک منٹ کے لئے بھی رہنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن مجھے زندہ رہنے کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ اور مجھے اس ٹنگمرگ کے سینی ٹوریم میں لایا گیا۔ اب یہاں بھی پڑے پڑے دو سال ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں میں جلد ہی ٹھیک ہو جاؤں گی لیکن میں جانتی ہوں کہ میں کبھی ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ میں ٹھیک ہونا نہیں چاہتی۔ اور آپ جلد ہی دیکھیں گے کہ اس سینی ٹوریم سے جہاں کہ آپ مجھے دیکھ رہے ہیں میرا تابوت نکلے گا۔ میں نہیں نکلوں گی۔۔ اوہ۔۔ یہ آپ کی آنکھوں میں نمی سی کیوں تیر رہی ہے۔۔ یہ آپ اداس سی نظروں سے میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں؟؟"

یہ کہہ کر تم خاموش ہو گئی ہو۔۔ میں مبہوت سا تمہارے پاس بیٹھا تمہاری آنکھوں میں تیرتی ہوئی وفاؤں اور قربانیوں کو دیکھ رہا ہوں۔۔ اور تم میری آنکھوں کی طرف دیکھ رہی ہو جن میں تمہیں نمی سی تیرتی نظر آ رہی ہے۔۔ یہ آنسو ہیں مریم! آنسو! آج مجھے تم سے ملے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ تم مجھ سے تقریباً بیس میل دور سینی ٹوریم میں پڑی ہو اور میں اپنے کمرے میں۔۔ لیکن آج بھی میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں۔۔ میں رو رہا ہوں۔ میری آنکھیں رو رہی ہیں۔ میرا دل رو رہا ہے اور ساری کائنات رو رہی ہے۔ جب ہی تو مجھے نیند نہیں آتی۔۔ اب خدا کے لئے بتاؤ مریم! میں

اب سوجانا چاہتا ہوں۔ اچھا خدا حافظ !!۔۔ لیکن یہ پھر تم میری طرف ڈبڈبائی آنکھوں سے کیوں دیکھ رہی ہو۔ اچھا مت جاؤ۔ دیکھتے جاؤ میری طرف۔ اس لیئے کہ میں اس مکروفریب میں مبتلا دنیا میں بھی اک تم میں وفا دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھوں میں جھانک کے تو مجھے ایک حقیقی عورت کا روپ نظر آرہا ہے۔ عورت جو مرد کو ایک بار چاہتی ہے اور پھر اسی چاہت کے گرد اپنی زندگی کے آخری سانس تک گھومتی ہے۔ میں نے سنا ہے پرانے زمانے میں عورتیں ستی ہوجایا کرتی تھیں۔ وہ مرد کی چتا کے ساتھ اپنے لیئے ایک اور چتا کو جنم دیتی تھیں۔ وہ ظالم رسم نہیں رہی۔ لیکن تمہارا یوں گھٹ گھٹ کے دم توڑ دینا ستی سے کچھ کم اذیت ناک رسم ہے کیا؟۔ وہ آگ میں کود پڑتی تھیں اور پھر ایک یا دو گھنٹے تک خاک ہو جاتی تھیں۔ لیکن تم جل رہی ہو آہستہ آہستہ۔ لمحہ بہ لمحہ۔۔ مہینوں، مہینوں سالوں اور نہ جانے کب تک۔۔؟ تم نے اپنی وفاؤں کے پھول کسی پر نچھاور کیئے لیکن تمہیں کانٹے ملے۔ تمہیں کسی سے پھولوں کی سیج کی امید تھی لیکن اس نے تمہیں آگ کی چتا پر لٹا دیا۔ تم نے اپنے پیار و خلوص کا ہاتھ کسی کے جسم پر پھیر دیا لیکن اس جسم نے سانپ بن کر تمہارے کومل سے ہاتھ کو ڈس لیا۔ اور پھر یہ زہر تمہارے سارے جسم میں سرایت کر گیا۔ اُف کتنے ظالم ہیں یہ مرد۔ میں کہتا ہوں۔ تم نے ایک مرد سے محبت کیوں کی۔؟ تمہیں چاہیئے تھا کہ کسی سانپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیتی۔ کسی اژدھے سے پیار کرتی۔ کیوں کہ مجھے یقین ہے وہ سانپ یا اژدہا تمہارے پیار کی مہک سے اس قدر سرشار ہو جاتا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے قدموں پہ اپنا سر ڈال دیتا۔ لیکن تم نے ایسا نہ کیا۔ تم نے ایک مرد سے پیار کیا۔ ایک مرد سے۔۔ مریم دنیا کے سب مرد منظور ہیں۔۔ سب اسی کی طرح کلیوں سے پیار جتا کر پھر انہیں اپنے پاؤں

سے نیچے مسل ڈالتے ہیں۔ آج جو تم اُن ہزاروں تپ دق میں مُبتلا لڑکیوں کو دیکھ رہی ہو۔ یہ سب مرد کی ٹھکرائی ہوئی ہیں ـــ آج جو تم لاکھوں کی تعداد میں لڑکیوں کو گناہ کی راہ پہ گامزن دیکھتی ہو۔ اُن کو بھی مرد ہی نے ایسا ہونے اور کرنے پہ مجبور کیا اُن کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہمارا ہے۔ اور صرف ہمارا ـــــــ اُف یہ میں تم سے کیا کیا کہہ گیا ـ کیا اب مجھے کبھی بھی نیند نہ آئے گی۔ کیا یہ رات اسی طرح آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ جائے گی ـــــ لیکن یہ باہر شور سا کیا سُنائی دے رہا ہے ـ لیکن باہر تو کوئی شور نہیں ہے ـ باہر صرف گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ اور میرے دل کے اندر ایک چتا سی جل رہی ہے۔ شعلے لپکتے جا رہے ہیں۔ اور ان شعلوں سے تاریکی میں کسی قدر کمی سی ہو رہی ہے ـ اب مجھے ٹنگمرگ کی سڑک صاف دکھائی دے رہی ہے ـ سڑک کے اُس پار سینی ٹوریم بھی صاف نظر آ رہا ہے ـ اور اس سینی ٹوریم کے ایک کمرے میں میں تمہیں اچھی طرح دیکھ رہا ہوں ـــــــ ! لیکن یہ کیا؟ یہ تم ہو کیا مریم ؟ آج تو تم بے حد حسین دکھائی دے رہی ہو ـ تمہارے رخساروں پہ گلاب کی پنکھڑیوں ایسی سرخ سرخ بہار چھائی ہوئی ہے ـ اور دیکھو یہ تمہاری نرگسی آنکھیں بھی کیا سحر پھونک رہی ہیں۔ ان آنکھوں میں تو ساحری کا تمام طلسم ناچ رہا ہے ـ یہ لو تم کھڑی ہو گئی ہو ـ شاخِ گُل کی طرح۔ سروِ آزاد کی مانند۔ تمہاری کافر زلفیں تمہارے نازک شانوں پہ بکھری پڑی ہیں۔ ہر طرف خوشبو ہی خوشبو ہے۔ نور ہی نور ہے ـ لیکن یہ آواز سی کیا آ رہی ہے ـ کوئی کہہ رہا ہے ـ جیسے دیئے کا تیل ختم ہو جاتا ہے تو بجھنے سے پہلے اس کی لو زور سے بھڑک اُٹھتی ہے ـ نور پھیل جاتا ہے۔ ایک لمحہ کے لئے۔ اور پھر دیا بجھ جاتا ہے۔ دیا بجھ جاتا ہے!! دیا بجھ جاتا ہے!!!

ہارجیت

شام حسین ہے!

اور نگین کے نیلگوں پانی کی سطح پہ ایک اکیلا ہوس بوٹ یوں دکھائی دے رہا ہے جیسے کسی دوشیزہ کے ہونٹوں پہ آئی ہوئی مسکراہٹ لرز رہی ہو۔ یا کوئی فاختہ اپنے گرم گرم نرم نرم پر سمیٹے پلکیں جھپک رہی ہو۔ چاند چناروں کے گھنے گھنے سرسبز پتوں کی اوٹ سے جھانک رہا ہے۔ اور ہوس بوٹ کا عکس چناروں کا سایہ لئے ساکن پانی پہ تھرا رہا ہے۔ جیسے کوئی جھیل میں نہانے کے بعد کنول کے پھول پہ بیٹھی اپنے رنگین پہ ٹھٹھرا ٹھٹھرا رہی ہو۔۔ ساری بستی خاموش ہے۔ پانی بھی خاموش۔ تختِ سلیمان بھی چپ، نگین بھی گم سم۔ لیکن نور دھیرے دھیرے بکھر رہا ہے اور کائنات کی ہر شئے اور ذرہ نور میں بس رہا ہے۔

اور اندر ہوس بوٹ میں کیپٹن شاہنواز پروفیسر تجید کو سمجھا رہا ہے کہ مرد صرف خوب صورتی چاہتا ہے۔ چاہے خوب صورت نظر آنے والی شئے کا باطن کتنا ہی گھناونا کیوں نہ ہو۔۔ مرد اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسے تو حُسن چاہیئے۔ اُس کی آنکھ حسن کو ایک نظر دیکھ لیتی ہے اور پھر وہ اسے سینے سے چمٹا لیتا ہے۔ یہ مرد کی نشانی ہے۔ اُس کی فطرت ہے۔ اب اگر کوئی اس بات سے اِنکار کرے تو مجھے بھی یہ کہنے سے اِنکار نہ ہوگا کہ وہ غلطی پہ ہے یا جان بوجھ کر جھوٹ بولتا ہے!

کیپٹن شاہنواز عمر کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر بھی جوان دکھائی دے رہا ہے۔ اُس کے جسم کا عضو عضو مضبوط ہے۔ کبوتر کے پروں کی طرح اُس کی سفید سفید گھنی گھنی موچھوں سے بھی طاقت ہی طاقت جھلک رہی ہے۔۔ جیسے انسان نہ ہو لوہے کا ہاتھی یا پتھر کا گھوڑا ہو!

"ہیں ۔۔۔" پروفیسر مجید نارنجی رنگ کا پائپ ہاتھ میں اُچھالنے لگا۔ "میں تمہارے جسم کا قائل ضرور ہوں شاہ لیکن تمہارے خیالات نے نہ مجھے کبھی قائل کیا اور نہ کر سکتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دُنیا میں صرف ایک واحد شخص تم ہی ہو جو ظاہری خوب صورتی کا قائل ہے۔ اور بھی تو بہت سارے ہیں۔ اُدھر کسی خوب صورت سی شے کو دیکھا اور اِدھر جان دے بیٹھے۔ لیکن کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو عورت کی کسی خاص ادا پر فدا ہوتے ہیں۔ چاہے تم اِس ادا کا نام سیرت ہی کیوں نہ رکھ لو۔ اگرچہ یہ خاص ادا ظاہری طور پر خوب صورت ہوتی ہے اور نہ عورت قلوپطرہ لیکن پھر بھی ۔۔۔"

"لوگ بدصورت عورت پر فدا ہوتے ہیں۔ ہا ہا ہا۔ میں تو یہ مان ہی نہیں سکتا۔ بدصورتی بدصورتی ہے اور خوب صورتی خوب صورتی ۔۔۔ انسان حُسن چاہتا ہے۔ کون بے وقوف ہے جو بدصورت عورت کی کسی ایسی ادا پر جان دے جو ادا بقولِ تمہارے ظاہری طور پر بھی خوب صورت نہ ہو۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتا۔ عورت خوب صورت ہے تو مرد کے دِل میں اِس کی جگہ ہے اور پھر تو وہ اس کی بدصورت ادا کو بھی خوب صورت تصوّر کرتا ہے ۔۔۔ لیکن۔ لیکن جب عورت خوب صُورت نہیں وہ لاکھ کوشش کرے کسی مرد کے دِل میں جگہ کرنے کی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ خوب صورتی جادو ہے ۔۔۔ اور جادو کا اثر یقینی ہے!

"یہ بات سارے مردوں پر لاگو نہیں آتی۔"

"سارے مردوں پر ہی کیا بلکہ ساری عورتوں پر بھی۔ لیکن تم جن مردوں کی بات کر رہے ہو وہ اس زمین کے نہیں ساتویں آسمان پر سانس لینے والے مرد ہونگے۔ لیکن مجھے اس پر بھی شک ہے۔ تمہیں ہی دیکھو میری زندگی میں کتنی لڑکیاں آئیں۔ جون کو تم جانتے ہو۔ تم بھی کئی بار میرے سامنے اس کی تعریف کر چکے ہو۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس نے میرے سارے دوستوں کے دلوں پر اپنا عکس چھوڑا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ اسے دیکھ کر تو سب دل تھام کے رہ جاتے تھے۔ اس کی نیلی نیلی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہی دل میں ایک طوفان سا جاگ اٹھتا تھا۔ اک آگ سی لگ جاتی تھی۔ بلا کی حسین اور فیشن ایبل ہونے کے باوجود کتنی پاکیزہ تھی۔ تمہارے ہی سامنے اس نے ناصر کے گال پر وہ طمانچہ مارا کہ بے چارے کی گردن ایک طرف کو لڑھک گئی۔ قصور اتنا تھا کہ اس نے جون کی حسین کلائی کو چوما تھا۔ آہ! جون مجھ سے کسی قدر محبت کرتی تھی۔ یہ بات کسی سے چھپی تو نہیں ہے۔ سب جانتے ہیں اس نے میرے ساتھ کتنے حسین لمحات گذارے ہیں۔ گھڑی بھر کے لئے بھی وہ مجھے اپنی نظروں سے دور نہ کرتی تھی۔ لیکن میں نے اسے چھوڑ دیا۔ اس لئے کہ ساجدہ اس سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اگرچہ غریب تھی لیکن تھی پریوں کی شہزادی اور میرے خوابوں کی ملکہ۔ اس نے اپنے بے پناہ حسن کی وجہ سے پہلی ہی نظر میں میرے دل میں جگہ کی اور میں نے اسے اپنا لیا۔ اپنا کیا لیا۔ اپنے بازوؤں میں جکڑ کے رکھا۔ تاکہ یہ کوئل کہیں پھر سے نہ اڑ جائے۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت تھی۔ اور اس کی ایک ایک ادا پہ جان دیتا تھا۔ اس کی عجیب عجیب فرمائشوں کو پورا کرنے میں مجھے کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا یہ

میں ہی جانتا ہوں ۔۔ لیکن بعد میں وہ مجھے دل سے چاہنے لگی ۔ کیونکہ عورت پہلے خدمت چاہتی ہے اور بعد میں خود خدمت گذار بن جانے میں خوشی محسوس کرتی ہے ۔ پھر اُس نے مجھے ذرہ بھر بھی تکلیف نہ پہنچائی ۔ بس صرف میری خدمت کرتی رہی ۔۔ مجھے چاہتی رہی ۔ یوں سمجھو وہ خود کو مجھ پر قربان کرنے لگی ۔ لیکن دو تین سال بعد میں نے اسے بھی طلاق دی ۔ اور سدھانہ کے پیچھے بھاگتا رہا ۔ بہت مدت تک میں اس کے پیچھے بھاگتا رہا اور پھر ایک مدت کے بعد وہ خود میرے پیچھے بھاگنے لگی ۔ وہ جیون اور ساجدہ سے زیادہ حسین تھی ۔ یوں سمجھو دستِ قدرت کا حسین شاہکار تھی وہ ۔۔۔ دو بار وہ یہاں میرے ساتھ کشمیر آئی ۔ اُسے کشمیر بہت پسند تھا ۔ اور مجھے وہ ۔۔ وہ یہاں کے گل لالوں سے زیادہ خوبصورت تھی ، چاندنی راتوں میں چمکنے والے زعفران کے پھولوں سے زیادہ دلکش اور دلفریب تھی ۔۔ کیا ہوا جو وہ زیادہ پینے کی عادی تھی ۔ پی کے تو وہ اور نکھر آتی تھی ۔ آہ ! جب وہ پی جاتی ہے پیتے پیتے نکھر جاتی اور پھر نکھرتے نکھرتے اُس کی سنہری زلفیں میرے بازوں پر بکھر جاتیں تو یقین کرو مجید میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے بعد اُس کے قدموں پر گر جاتا تھا ۔۔ لیکن پھر وہ بھی میری نظروں سے گر گئی ۔ میں نے اُسے اپنے گھر سے نکال کر اپنے دل سے بھی نکال دیا ۔ کیونکہ میرے دل میں شہلا اپنا گھر کر بیٹھی ۔ اور ابھی تک میں اسے اپنی پلکوں پر بٹھا کر اپنے دل میں چھپائے ہوئے ہوں ۔ اس لئے کہ ابھی اس سے زیادہ حسین لڑکی میری نظروں سے نہیں گذری ۔ شہلا حسین ہے ۔۔ لیکن تم نہیں جانتے مجید کہ وہ خطرناک قسم کا جوا کھیلتی ہے ۔۔ اُس نے میری نصف سے زیادہ دولت اسی جوا بازی میں برباد کی ۔ لیکن میں نے کبھی اس کی پروا نہ کی ۔

LOVE IS BLIND ہے۔ میں اسے اور بھی زیادہ چاہتا ہوں۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا ہوں۔ صرف اسی لیے کہ وہ خوب صورت ہے۔ اور جب تک وہ خوب صورت ہے میری زندگی ہے۔۔ اب ذرا تم ہی بتاؤ میں کسی بدصورت لڑکی کے لیے اتنا کچھ کر سکتا ہوں۔ یا اور کوئی کر سکتا ہے کیا۔؟ یہاں تمہارا فلسفہ کتنا جھوٹ ثابت ہوتا ہے کیونکہ میں بھی ایک عام قسم کا آدمی ہوں۔ وہ مرد جو اپنے ہاتھوں میں خوب صورت چیز لیتے ہوئے بھی کوئی دوسری خوب صورت ترین چیز دیکھ لیتا ہے تو جھٹ اپنے ہاتھ سے یہ خوب صورت چیز پھینک کر خوب صورت ترین چیز کے پیچھے بھاگتا ہے۔ کیونکہ اب اس کی پہلی چیز میں کوئی خوب صورتی نہیں رہتی۔۔ خیر اب میں زیادہ فلسفی بننے لگا۔ لیکن تم مان جاؤ کہ تم غلطی پر ہو۔۔۔ ارے شہلا کدھر چلی گئی۔۔ مجھے تو خیال ہی نہ رہا۔۔"

"وہ تو اندر باتھ روم میں ہے" پروفیسر مجید نے پائپ میں تمباکو بھر کر اُسے انگوٹھے سے دبا کر کہا۔

شہنواز نے تشویش بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "کہیں اُس نے ہماری باتیں سُن تو نہ لیں؟"

پروفیسر مجید نے ہنستے ہوئے دھوئیں کا ایک مرغولہ شہنواز کے چہرے پر بکھیر دیا۔ "نہیں شاہ۔ عورت نہاتے وقت صرف اپنے آپ میں کھو جاتی ہے۔ اتنی کھو جاتی ہے کہ کسی اور کی بات سُن ہی نہیں سکتی۔ چاہے کوئی اُس کے نزدیک ہی اُس کی بُرائی کر رہا ہو۔۔۔"

"ہاہاہاہا۔ کن گہرائیوں میں ڈوب جانے کی عادت ہے تمہیں بھی۔ اچھا یہ تو بتاؤ

یہ ہماری مسز مجید کدھر گئیں ۔؟"

" ابھی تو تم اسے ڈیک چیر پہ بیٹھے مونزے سُنتے دیکھ آئے ہو ۔"

" ہاں ہاں یاد آیا ۔ جانے میری یادداشت اتنی کمزور کیوں ہو گئی ہے مسٹر مجید ہر بات بھول جاتا ہوں"

" اور یہ بھول تمہیں عورت کے بھول جانے میں بھی ہوتی ہے ۔"

"نہیں ۔ ہاں اب اگر تم اسے بھول کا ہی نام دیتے ہو تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ بھول دنیا کے ہر مرد سے ہو جاتی ہے ۔ یا لوں سمجھو وہ ایسا کرنے اور پینے پر مجبور ہے ۔ دل مجبور کرتا ہے ۔ فطرت مجبور کرتی ہے ۔ یہاں میں اس دل کی بات کرتا ہوں جو جوان ہو مردہ نہیں ۔ اور اس فطرت کے متعلق کہہ رہا ہوں جو عام معنوں میں مرد کی فطرت سمجھی جاتی ہے ۔ اب سوال یہ رہا کہ مرد ہمیشہ خوبصورت ۔ خوبصورت ۔"

اس سے آگے شہنواز کچھ نہ کہہ سکا ۔ الفاظ اس کے ہونٹوں پر ہی دم توڑ بیٹھے ۔ اور یہ سب کچھ ایک دم میں اس لیئے ہوا کیونکہ باتھ روم کا دروازہ آہستہ سے کھلا دروازے پر آویزاں ریشمی پھولدار پردہ ہل گیا اور اندر سے شہلا نکل آئی ۔ نکھری اور سنوری ہوئی ۔ ارغوانی آنکھیں ۔ دہکتا ہوا بدن ۔ اور سیاہ چمکیلی زلفیں سرخ و سفید نازک سے شانوں پر بکھری پڑی ہیں ۔ لباس اتنا ہلکا پھلکا اور باریک کہ انسان کی آنکھیں دھوکا کھا جاتی ہیں ۔ بالکل اس مغل شاہنشاہ کی طرح جس کے سامنے شہزادی اٹھارہ جوڑے پہن کر سلام کو آئی اور شاہنشاہ زہر آلود نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا " تم ننگی کیوں چلی آئی ہو ؟" ۔ لیکن یہاں شہلا پر کسی نے اعتراض نہیں کیا ۔ شاید دنیا بدل گئی ہے ۔ ترقی کر گئی ہے ۔ انسان

بدل گیا ہے اور ترقی کر گیا ہے ۔ شہلا محبوبانہ انداز میں کھڑی تھی ۔ نازک نازک لبوں پر تھرکتی ہوئی پیپریاں ہولے ہولے ناچ رہی تھیں۔ شہنواز اپنے چہرے پر تازگی کے آثار پیدا کرتے ہوئے صوفے سے اُٹھا اور دو قدم آگے بڑھ کر بڑی احتیاط سے رات کی رانی کی نازک سی کمر میں ہاتھ ڈال کر بولا۔

" ہلو لیڈی آف دی نائٹ "

وہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھانا ہی چاہتا تھا کہ لچکتی ہوئی کمر یوں اس کے ہاتھ سے نکل کر پروفیسر مجید کے پہلو میں بیٹھ گئی جیسے چکنی مچھلی ہاتھ سے پھسل کر تالاب میں کود جاتی ہے۔

اردگرد کی ہر شے مہک رہی تھی ۔ چمک رہی تھی ۔ مسکرا رہی تھی ۔

شہنواز ایک بار پھر کھڑا ہوا اور ڈیک کی طرف گیا ۔ چند لمحے بعد اُس کے ساتھ مسز مجید آئیں ۔ معمولی سے خدوخال کی عورت ۔ جس میں کسی قسم کی جاذبیت نظر نہ آ رہی تھی ۔ چاروں میز کے اردگرد بیٹھ گئے ۔ گرم گرم کافی کے دَور چلنے لگے ۔ قہقہے بکھرنے لگے ۔ اور ہاؤس بوٹ کی ہر شے جیسے ناچنے لگ گئی ۔ شہلا کی نگاہیں ناچ رہی تھیں ۔ اس نے مخصوص طرزِ ادا سے اپنی نیم وا آنکھیں پروفیسر مجید کی آنکھوں میں ڈال کر اپنی مخصوص سریلی آواز میں کہا ۔

" اچھّا تو اب پروفیسر صاحب یہ بتائیں گے کہ یہ یہاں خوبصورت ۔ خوبصورت کی کیا بحث چھڑ رہی تھی ۔ ۔ ؟ "

شہنواز نے گلے میں مفلر کو ٹھیک طرح سے باندھا اور پھر ساری بات چیت کا خلاصہ سمجھا دیا ۔ چند لمحے گذرنے پر شہلا کی نازک نازک سی پتلیاں ایک بار پھر

گھوم گئیں۔

"اچھا تو آج ہم پروفیسر صاحب سے کچھ سُنیں گے۔"

پروفیسر مجید کی نظریں میز پر جمے جمے کچھ کھو سی گئیں۔

"کیا سُنیں گی آپ۔؟"

"یہی کہ آپ کو بھی کبھی کسی سے محبّت ہوئی ہے کیا۔؟"

"پہلے ہم آپ کے دل کی سُننا چاہتے ہیں"۔ پروفیسر مجید نے آنکھیں اوپر اُٹھائیں۔

"میرے دل کی یہ کیا۔؟" شہلا نزاکت سے بولی۔

"یہی کہ آپ کو بھی کبھی کسی سے محبّت ہوئی ہے کیا۔؟"

"ہاں۔ لیکن میں نے اسے چاہا تو بہت مگر۔۔۔!"

"مگر کیا۔؟"

"مگر اُس نے مجھے نہ چاہا"

"جھوٹے" شہنواز زیرِ لب بڑبڑایا۔ "ہم نے تمہیں دل سے زیادہ چاہا ہے ڈارلنگ"

پروفیسر مجید نے انگلیوں سے میز کو بجاتے ہوئے شہلا کی طرف دیکھا۔

"بس یا کچھ اور بھی کہیں گی آپ۔؟"

"بس۔ اس سے زیادہ میں کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتی۔ نہ جانے کیوں؟ خیر اب تو ہم پہلے آپ کے دل کی سُنیں گے۔"

مسز مجید خاموشی سے بیٹھی رہی۔ شہنواز بھی صوفے پر اچھی طرح جم کر بیٹھ گیا۔ اور شہلا نے سفید کشمیری شال اپنے گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے بہت ہی شوخ انداز میں کہا۔

"بتائیے نا اب۔"

شہلا کا ہاتھ پروفیسر مجید کے بالوں سے کھیلنے لگا۔ اور وہ اپنے اُس مخصوص لہجے میں بولتا گیا جو اُس کا کالج میں لیکچر دیتے وقت ہُوا کرتا تھا۔

"ہاں تو مجھے بھی کسی سے محبّت ہوئی تھی۔ ہوئی کیا تھی۔ یوں کہیئے کہ ہوئی ہے۔ اور ابھی تک میرے دل میں مہک رہی ہے۔ لیکن شاہ؟"

"کیا ہُوا بھئی۔ سُنائیے جو لگے تھے"

"تم میری اس کہانی کو اچھّی طرح سنو گے۔ ہو سکتا ہے میری کہانی سُننے کے بعد تم اپنے لیکچر کے نفیر والے خیالات میں ترمیم کرو۔"

شہنواز زیرلب مسکرایا اور پھر صوفے میں دھنس گیا۔ پروفیسر مجید نے اپنے سے دُور بیٹھی مسز پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کہا۔

"ہاں جناب تو میری پہلی محبّت کچھ عجیب طریقے سے پیدا ہوئی ہے اور پروان چڑھی ہے۔ بالکل عجیب طریقے سے۔ اِس قدر عجیب طریقے سے کہ آپ سُن کر حیران ہو جائیں گے۔ میں کئی بار اس لڑکی سے باتیں بھی کر چکا تھا۔ بس کچھ یوں ہی سی باتیں)۔ ان باتوں میں محبّت کا ایک لفظ تک نہ ہوتا تھا۔ کیونکہ اُس لڑکی میں کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ کوئی کشش نہ تھی کہ بس آدمی ایک ہی نظر میں دل تھام کے رہ جاتا۔ یا کیوپڈ تیر کی سی تیزی کے ساتھ اپنا تیر پھینک دیتا۔ وہ معمولی قسم کی لڑکی تھی۔ اتنی معمولی کہ مرد ایک نظر دیکھ کر دل میں دوسری بار اُسے دیکھنے کی تمنا ہی نہ کر سکے۔ لیکن میری محبّت کا وہ یادگار اور خوشگوار دن مجھے کبھی نہ بھولے گا جب میں کسی کام سے اس لڑکی کے گھر گیا جس میں کوئی ظاہری خوب صورتی نہ تھی۔ کوئی جاذبیت نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ میرے دل میں اپنا عکس کچھ اِس انداز سے چھوڑ گئی کہ شاید ہی کبھی یہ عکس میرے دِل سے مِٹ سکے۔ جب

میں اُس کے گھر گیا تو ابھی میں باہر کے دروازے کے اندر ہی آیا تھا کہ میری نظریں دائیں طرف کی زمین کی اس طرف کو اُٹھیں جہاں سبزے پر وہ لڑکی نماز پڑھ رہی تھی —— وہ معمولی سفید لباس میں تھی —— لیکن میں کھڑے کا کھڑا ہی رہا — وہ بہت ہی توجہ کے ساتھ نماز پڑھ رہی تھی — اُس کے جسم کا انگ انگ ایک خاص ادا کے ساتھ ہل رہا تھا اور اللہ کے حضور میں جھک جاتا تھا۔ میں نے آج تک کسی کو اس توجہ کے ساتھ نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن دنوں میں گھر والوں کے بار بار اصرار پر صرف عید کی نماز ادا کرتا تھا۔ کیونکہ عید کو عیدگاہ میں بہل پہل ہوتی ہے۔ لیکن جانے میں کیوں اس لڑکی کو اپنی تمام تر توجہ کے ساتھ دیکھنے لگا۔ جانے کیوں؟ وہ نماز ادا کر چکی اور پھر جانماز پر اپنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس کی سفید ساری کا پلو اس کے پاکیزہ ماتھے پر آ گیا۔ اور پھر یہ ہاتھ دھیرے دھیرے اُوپر کو اُٹھے — دُعا کے لئے —— اس کی پلکیں اُس کے رخساروں کو چھو رہی تھیں۔ سارا جسم بے حس و حرکت تھا۔ جیسے سنگِ مرمر کا تھا مجسمہ —— پھر جب وہ دُعا مانگ چکی — تو پلکیں تھرتھرائیں اور آنکھیں نیم وا ہوئیں — میں دیکھتا رہا اُس کی پوری آنکھیں کھل گئیں۔ میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور میرے پہلو میں دل دھڑکتا رہا۔ شاید کیوپڈ اپنا تیر پھینک چکا تھا — اور آج آپ اُس نماز پڑھنے والی لڑکی کو مسز مجید کے نام سے جانتے ہیں ——"

شہلا اور شہنواز حیرانگی سے مسز مجید کی طرف دیکھنے لگے۔ اُس کی سیاہ پلکیں اُس کے رُخساروں پر جھک آئی تھیں اور ہونٹوں کے کونوں میں خفیف سی لرزش ہو رہی تھی —

"لیکن شہنواز ——" پروفیسر مجید نے ایک بار پھر سنبل کو اپنی طرف مُتوجہ کیا ——

"تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اُن دنوں میری نظروں میں کوئی اور لڑکی تھی ہی نہیں کہ بس میرا دل اسی پہ آگیا۔ بہت ساری تھیں شہناز جنہیں میں اپنا سکتا تھا۔ لیکن جانے کیا بات تھی اُنہیں دیکھ کر میرا دل دھڑک کیوں نہ جاتا تھا۔۔۔؟ میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی کیوں نہ رہ جاتی تھیں۔ تم یقین نہ کرو کہ تمہاری جوانی جس میں تمہیں دُنیا بھر کی رنگینی اور رعنائی نظر آتی تھی تم سے پہلے مجھ میں کتنی دلچسپی لیتی تھی۔۔۔ اور یہ تمہاری شہلا جس کو تم دُنیا بھر کی بہترین شئے سمجھ رہے ہو۔ امّی سے پوچھو کہ آج سے چار پانچ سال پہلے جب تم ایک دوست کو جانتے تک نہ تھے کتنی بار مجھ سے اپنے دل کا درد سمجھا چکی ہے۔ کیوں شہلا۔۔۔؟"

لیکن شہلا کچھ نہ بولی۔ اُس کے ہونٹ بند ہی رہے۔ صرف اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی سی تیرنے لگی۔ اور اس کا نازک ہاتھ جیسے ٹوٹ کر پروفیسر مجید کے بالوں سے ہٹ کر نیچے گر آیا۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اوہ مجھے تو بہت نیند آرہی ہے۔۔۔"

اب کی بار اُس کی مخصوص سُریلی آواز جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔ اُس کے قدم ڈگمگاتے ہوئے بیڈروم کی طرف بڑھنے لگے۔ شہناز نے ایک عجیب اور سراسیمگی کی حالت میں اس کی لچکتی ہوئی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ لیکن نازک کمر ایک بار پھر اُس کے ہاتھ سے پھسل کر سبز مخمل کے نرم لحاف میں دبک گئی۔۔۔ کمرے کی سفید روشنی بجھ گئی۔ اور نیلی روشنی بکھر پڑی۔ اور اس نیلی نیلی روشنی میں ایک سسکی کی آواز آئی۔

"ہونہہ۔ نان سینس پروفیسر"

اندھیر اجالا

پُشکر نے کمرے کی کھڑکی تک پہنچی ہوئی دھوپ سے اندازہ لگایا کہ ساڑھے نو بج گئے ہیں۔ اُس نے رات کی بچی ہوئی روٹی ماں سے مانگ کر کھائی۔ جگہ جگہ پیوند لگا ہُوا کوٹ کھونٹی سے اُتار کر جلدی جلدی پہن لیا اور اپنے مالک سیٹھ مادھو رام کی دوکان کی طرف جا نکلا۔ راستے میں اسے سیٹھ جی کی کوٹھی سے بھی گزرنا پڑا۔ یہاں پہنچکر اُسے کامنی یاد آئی۔ ہنس مکھ اور حسین کامنی — اِس وقت اُس نے خود کو سیٹھ جی کا منشی تصوّر نہیں کیا بلکہ ایک مرد ایک جواں مرد اور کامنی بھی اُسے سیٹھ جی کی لڑکی نہیں بلکہ ایک جوان دل والی لڑکی ہی دکھائی دی — اندر سے وائلن بجانے کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹھک گیا۔ کامنی ہی تو ہے۔ یہ سوچ کر وہ پھاٹک کے قریب چند منٹ ٹھہرا۔ پھاٹک پہ ایک لیٹر بکس بھی لگا تھا۔ کاش! وہ اس میں کامنی کے نام ایک خط ڈال سکتا۔ وہ اُسے سمجھ سکتی۔ اُس کے دل کی دھڑکنوں کو گن سکتی ہے۔ یہ خیال بھی گزر گیا۔ اُس کی نگاہیں لیٹر بکس کے بائیں طرف کے ایک سوراخ پہ جم گئیں۔ سڑک پہ بہت سارے آدمی چل رہے تھے۔ لیکن اُس نے اُن کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور اپنی ایک آنکھ سوراخ سے لگا کر اندر جھانکنے لگا۔ سب سے پہلے اُس کی نظر کوٹھی کی اُوپر والی منزل پہ ٹھہری۔ جہاں

کامنی کا کمرہ تھا۔ جہاں اکثر اُس نے کامنی کو دیکھا تھا۔ لیکن آج کمرے کی ساری کھڑکیاں بند دیکھ کر وہ پریشان سا ہُوا۔۔۔ وائلن کی آواز اسی طرح برابر اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ اور پھر اچانک اس کی نظر کے سامنے کامنی آئی وہ گلاس کے درخت کے نیچے وائلن پر کامنی کی پتلی پتلی انگلیاں ناچ رہی تھیں۔ تھرک رہی تھیں۔ اُس کے لبوں سے نکلتے ہوئے میٹھے میٹھے بول وائلن کے دلفریب اور دلکش آوازوں کے ساتھ فنکارانہ انداز سے گھُل مِل رہے تھے۔ اِسے ایسا محسوس ہُوا کہ ان پتلے پتلے سرخ سرخ لبوں سے نکلتے ہوئے میٹھے میٹھے بول صرف اُس کے لئے ہیں۔ اور ان مدھر مدھر گیتوں میں وہ اسے کچھ کہہ رہی ہے۔۔ جب گاتے گاتے سر کی جنبش سے کامنی کے بکھرے ہوئے بالوں کا کوئی گچھا اس کے سرخ و سفید چہرے پر لہرانے لگتا اور کامنی اسے سر کے ایک ہی جھٹکے سے چہرے سے ہٹا لیتی تو وہ سمجھ لیتا تھا اس جھٹک سے صرف یہ اشارا ہے کہ کامنی اسے بُلا رہی ہے۔۔ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ اُس نے اپنے جسم میں کوئی لاوا سا محسوس کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ابھی پھاٹک کے دو ٹکڑے کر کے کامنی کے پاس پہنچ جائے۔۔۔ اُسی وقت اس نے اپنی ٹانگوں پر کوئی حرکت سی محسوس کی۔ مُڑ کے دیکھا تو کامنی کا کالے کالے اور گھنے گھنے بالوں والا کتا اُس کے پاجامے کو چاٹ رہا تھا۔ اُسے پہلے کُتّے پر بہت غصّہ آنے لگا۔ لیکن پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ اس حرکت سے بہت خوش ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ اب کامنی کا کُتا صرف اُس کے پاجامے ہی کو نہیں بلکہ سارے جسم کو چاٹتا رہے۔ جیسے کامنی ہی اس کی ٹانگوں کو چوم رہی ہو۔۔ اُس کے سارے بدن کو چوم رہی ہو!!

نیل کنول مُسکائے

کُتّا اُسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بھونک کرکے وہاں سے چل دیا۔ اسے دُکان کا خیال آ گیا۔ سیٹھ جی کی دھمکی اور جھڑکی کا احساس ہوا۔ اس احساس سے اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے سیٹھ جی ہی اُس کی میٹھی سی زندگی میں زہر گھول رہا ہو۔ لیکن پھر وہ تیز تیز قدموں سے دُکان کی طرف چل پڑا۔

دُکان پر پہنچ کر اُس نے ڈرتے ڈرتے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر دبی زبان سے سیٹھ جی کو نمستے کہا۔ اُسے یقین تھا کہ آج سیٹھ اُسے دیر سے آنے پر حسبِ معمول ماں بہن کی گالی دے گا۔ اسے نوکری سے الگ کرنے کی دھمکی دیگا اور پھر اُسے رو رو کر سیٹھ جی سے معافی مانگنی پڑے گی۔

لیکن آج سیٹھ نے اس سے کچھ نہ کہا۔ نہ جانے کیوں؟ وہ لکڑی کے صندوق کے سامنے بیٹھ گیا۔ دوات کو تھوڑا سا ہلا کر روشنائی دیکھی۔ قلم سنبھالا اور بہی کھاتہ وہیں صندوق پر رکھ دیا۔

"منشی جی! چاول کا سارا حساب ٹھیک ہے؟"

"سب کچھ ٹھیک ہے سیٹھ جی!"

لبوں پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"پچھلے ماہ چاول کا کیا نفع درج کیا تم نے؟" سیٹھ نے دوسرا سوال کیا۔

پشکر نے بہی کھاتے کے چند ورق پلٹ کر جواب دیا۔

"دو لاکھ سیٹھ جی"

"ٹھیک ہے!"

"سیٹھ جی آج مجھے تنخواہ مل جاتی۔! میری ماں بیمار ہے۔ اور گھر میں چاول کا ایک

دانہ تک نہیں"

پُشکر نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"پانچ پیہ لوکولے جاؤ منشی جی ! ہم نے کچھ کھایا ہے تمہارا پیسہ ؟"
سیٹھ جی نے سنجیدگی سے کہا اور خاموش ہو گئے۔

"اور سیٹھ جی اُس بابو کا روپیہ ـــ وہ تو روز شکایت کرتا ہے"۔

"کس بابو کا ؟"

"وہی سیٹھ جی جو چاولوں کے لئے کنکر لایا تھا"

"بکو مت ! ..." ڈر ..... "اُس کا کتنا روپیہ بنتا ہے ؟"

"تین سو سیٹھ جی"

"تین سو ـــ ! چند کنکریوں کے تین سو ـــ میرے روپے کنکر نہیں منشی جی ـــ دو سو اُسے دے دینا"

پُشکر دل سے سوچنے لگا کاش وہ سیٹھ جی سے کہے ـــ سیٹھ جی تمہارے روپے ہرگز کنکر نہیں۔ کنکر تو ہمارے روپے ہیں۔ ہم روپے سے کنکر خریدتے ہیں۔ اور تم کنکر سے روپیہ ـ تمہارا سب روپیہ کھرا ہے اور ہمارا کھوٹا۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

سیٹھ جی نے رسیور اُٹھایا۔

"کون کامنی بیٹی ـــ ہاں ہاں ...... کیا کہا ؟ .... اُدھر کوئی نوکر نہیں ہے کیا ؟ ...... ٹھیک ہے ـــ لیکن مہاراج تو اُدھر ہی ہوگا ...... اچھا بھیج دوں گا۔ تم فکر نہ کرنا ـــ ابھی بھیج دیتا ہوں ـــ"

اور سیٹھ پُشکر سے کہہ رہا تھا۔

"دیکھو مُنشی جی۔ کامنی بیٹی کا ٹیلیفون آیا ہے۔ تمہیں بُلا رہی ہے۔ پر تم واپس بھی جلد آؤ گے۔"

پُشکر دُکان سے نیچے آیا۔ کوٹ کی سلوٹیں ٹھیک کیں۔ پھٹے ہوئے جوتے کا گِھسا ہُوا تلا جو باہر کو لٹک گیا تھا، دیکھا۔ چہرے کو دونوں ہاتھوں سے رگڑ کر کامنی کی پسند کے مطابق بنانا چاہا۔ اِس حالت میں اُسے کامنی کے پاس جاتے ہوئے شرم سی محسوس ہو رہی تھی۔ اب یہ سیٹھ کِتنے دِن زندہ رہے گا۔ روز میں سوچتا ہوں آج مر جائے گا۔ لیکن مرتا نہیں۔ کاش آج سیٹھ مر جاتا۔ تو اُس کے سارے روپے میں لے جاتا۔ اور کامنی کو خبر بھی نہ ہونے دیتا۔ روپے کی مجھے کتنی ضرورت ہے۔ اب میں کب تک شادی کے بغیر رہ سکتا ہوں۔ اور پھر ماں کی حالت بھی تو خراب ہے۔ اُس کے علاج کے لئے بھی روپے چاہئیں۔ کاش! سیٹھ مر جاتا تو میں کامنی سے شادی کرتا۔ میں بھُوکا نہ رہتا۔ میرے پاس بھی روپیہ ہوتا۔ اور کامنی میرے قدم چُوم کر کہتی سیٹھ پُشکر ناتھ جی۔ آپ میرے ساتھ شادی کیجیئے۔ میں آپ سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ اُس وقت ساری دُنیا میرے قدم چُوم لیتی۔

یہ سوچتا ہُوا وہ آگے بڑھا۔

اچانک ایک اور خیال نے آ گھیرا۔

کامنی نے مجھے کیوں بُلایا ہے۔ شاید صبح اُس نے مجھے پھاٹک سے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا ہو۔ لیکن وہ کیسے دیکھ سکتی۔ وہ کبھی ختم ہو گئی ہو گی۔ لیکن کل

ہی تو تنین بوتلیں لے آیا تھا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ کامنی مجھے کہے گی۔
"پُشکر ناتھ تم ڈرتے کیوں ہو۔ تم سیٹھ جی سے ڈرتے ہو کیا۔ وہ دُکان پر رہتے ہیں۔ انہیں کیا پتہ گھر میں کیا ہوتا ہے۔ آؤ پُشکر ناتھ آج ساتھ پئیں گے"

اور پھر محبّت بھرے انداز میں کہے گی۔
"تم مجھے کتنے اچھے لگتے ہو ڈارلنگ۔!"

یہ خیال آتے ہی اُس کے جسم کی حرارت میں اور زیادہ اضافہ ہوا۔ سامنے سیٹھ جی کی کوٹھی تھی۔ اُسے یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ اتنی جلدی کوٹھی کے نزدیک پہنچا ہے باہر پھاٹک کے سامنے ایک پیلے رنگ کی کار کھڑی تھی جس کی پشت پر سفید حروف میں "ہندوستان اسٹینڈرڈ" (HINDUSTAN STANDARD) لکھا ہُوا تھا۔ پُشکر کو اپنے سپنے بکھرتے ہوئے محسُوس ہوئے۔ لیکن وہ پھاٹک سے گُذر کر صحن میں داخل ہُوا۔ بوڑھا مالی پھُولوں کی ایک کیاری کے پاس ہی حُقّے سے دھوئیں کے مرغولے نکال رہا تھا۔
"نمستے منشی جی!"

مالی نے حُقّے کی نے مُنہ سے الگ کی۔

"نمستے!"

اس نے رسمی طور پر جواب دیا۔ اور کوٹھی کی جانب بڑھا۔ دوسری منزل کی سیڑھیوں پر سے گذرتے ہُوئے اُس کے کانوں میں کامنی کے قہقہے کی گونج سُنائی دی۔ اُس کے قدم آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرتے گئے۔

کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ لیکن پردہ بدستور لٹک رہا تھا۔ پردے کو ایک طرف سرکا کر وہ اندر داخل ہُوا۔ اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کامنی ایک خوش پوش نوجوان کے سامنے نیم عُریاں لباس میں بیٹھی تھی۔ پُشکر پہ ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ اُس کی نظریں کبھی فرش پر جم جاتیں۔ کبھی کامنی کے پتلے ہونٹوں پہ۔ جن کے درمیانی حصّے سے لپ سٹک غائب تھی۔ اور کبھی نوجوان کے ہونٹوں کو دیکھتا۔ جن کے درمیانی حصّے پر لپ سٹک کی ایک ہلکی سی تہہ جم گئی تھی۔ پھر اپنے خشک سے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگ جاتا۔ لیکن کامنی نے اُس کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اُس نے اُسے دیکھ کر بھی اپنا عُریاں جسم نہ ڈھانپا۔ اُس کے بال اسی طرح بکھرے پڑے تھے۔ اور پُشکر کو ایسا معلوم ہُوا جیسے اس وقت کامنی کی نگاہوں میں اُس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جیسے وہ انسان نہیں۔ ایک حیوان ہے۔ جسے دیکھ کر بھی انسان ہر جائز و ناجائز حرکت کرنے سے نہیں چوکتا۔ اُسے اِس وقت کامنی اور نوجوان پہ بہت غُصّہ آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اسی وقت نوجوان کے سینے میں چھُرا گھونپ دے۔ تاکہ اس کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ اور اس کے ساتھ اس کی "ہندوستان اسٹینڈرڈ" بھی!

"دو بوتلیں مُنشی جی"

کامنی نے ٹیبل پہ پڑے ہوئے پرس سے دس دس کے دس نوٹ اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

دو پیے لے کر وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ زینے سے اُترتے ہوئے اُس نے

مُٹھی کے نوٹ احتیاط سے کوٹ کے اندر کی جیب میں ڈالے۔ آخری زینہ طے کرنے کے بعد برآمدے میں اُس کا پیر کسی چمکیلی چیز کے ساتھ ٹکرایا۔ وہ نیچے جُھکا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار کا چھرا آ گیا۔ وہ کچھ سوچنے لگا۔ اور چھرا پھر وہیں رکھ دیا۔ لیکن پھر کچھ اور سوچ کر اُٹھایا اور مضبوطی سے سینے میں باندھ لیا۔

چھاٹک کے سامنے ہندوستان اسٹینڈرڈ نے اُس کا ایک بار استقبال کیا اُس نے نفرت سے ایک طرف مُنہ موڑ لیا۔ اور جلد جلد قدموں سے آگے بڑھا۔ اُسے اپنے دل پر ایک بھاری سا بوجھ محسوس ہوا۔ نہ جانے کون سی زہریلی شے اُس کے انگ انگ اور روئیں روئیں میں سرایت کر



نیو انڈیا سٹور سامنے ہی تھا۔

وہ دُکان میں داخل ہوا۔ خوشنما بوتلیں الماریوں میں قرینے سے رکھی ہوئی تھیں اُس نے جیب سے روپے نکال کر کونٹر پر رکھ دئے۔ اور اس کے ہاتھ میں شراب کی ۲ دو چمکیلی بوتلیں آ گئیں!

وہ جلدی سے واپس آیا۔ دونوں زینہ طے کر لئے اور کمرے میں آ گیا۔ ٹیبل پر ہلکے گلابی رنگ کے دو گلاس پڑے تھے۔ اب وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ پشکر کے ہاتھوں میں دو نئی بوتلیں دیکھ کر اُن کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ بھامنی نے اُس کے ہاتھوں سے بغیر کچھ کہے دونوں بوتلیں لے لیں اور ایک کا کاگ اُڑا کر شراب گلاسوں میں انڈیلنے لگی۔

"چوم لے ہونٹ لال پری کے ڈارلنگ!"

نوجوان کامنی سے مخاطب ہُوا۔ جس کا جواب کامنی نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہلکی سی مسکراہٹ سے دیا۔ پُشکر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اُس کا ہاتھ نیفے میں رکھے ہوئے چھرے کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن پھر رُک گیا۔ نوجوان نے ایک پیگ حلق میں انڈیلتے ہوئے اُس کی طرف پانچ روپے کا کرکراتا ہوا نوٹ بڑھا دیا لیکن اُس نے انکار کر دیا۔ آخر کامنی کے اصرار پر رکھ لیا اور باہر آگیا۔

باہر پھر ایک بار ہندوستان اسٹینڈرڈ اُس کا مُنہ چڑھا رہی تھی۔ اُس کی حالت پر جیسے قہقہے لگا رہی تھی۔ وہ اُس کے نزدیک آیا۔ اور پانچ روپے کا نوٹ اپنی جیب سے نکال کر اُس کی پچھلی سیٹ پر چھوڑ دیا۔ اور دکان کی طرف چل پڑا۔

دُکان پر پہنچتے ہی سیٹھ نے اُسے چاولوں کے نرخ نقل کرنے کو کہا۔ اور خود اندر گودام میں چلا گیا۔ پُشکر نے اخبار اور بہی کھاتہ ایک طرف کو ٹیک دیا۔ اور وہ بھی گودام کی طرف بڑھا۔ اُس کا تیز دھار والا چھرا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ سیٹھ واپس دُکان پر آرہا تھا کہ پُشکر نے اُس کے باہر نکلے ہوئے پیٹ میں چھرا گھونپ دیا۔ سیٹھ وہیں گودام میں کنکر ملے ہوئے چاولوں کی بوریوں کے پاس ہی ڈھیر ہو گیا۔ اُس نے اُس کی جیبوں کی تلاشی لے کر چابیاں نکال لیں۔ باہر دکان پر آ کر سیف سے ان گنت روپے نکال کر دکان کو تالا لگا دیا۔ اور سیٹھ جی کی کوٹھی کی طرف چلا۔ صحن میں کوئی نہ تھا نہیں۔ نچلے کمرے میں چند ملازم تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ جلدی جلدی اُوپر پہنچا۔ کامنی کے کمرے کو خالی دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ اور سیٹھ جی کے کمرے میں داخل ہُوا۔ سیٹھ جی کے سرہانے

رکھی ہوئی لوہے کی الماری کا تالا کھولا اور لاکھوں روپے کا ایک بڑا سا تھیلا سنبھالکر واپس نیچے آیا اور اپنے گھر کا رُخ کیا۔

گھر میں اُس کی دمہ کی مریض ماں چپ لطے کے سامنے سو رہی تھی۔ بھوک سے اُس کا چہرہ اور بھی نڈھال ہو گیا تھا۔ اُس نے اُسے جگانا مناسب نہ سمجھ کر اُس کے سرہانے پانچ ہزار کے نوٹ رکھ دیئے۔ اور اُسی دن وہ اپنے شہر سے فرار ہو گیا ——!

اب وہ بمبئی میں رہ رہا تھا۔ اُس کی ایک کوٹھی تھی۔ ایک کار تھی۔ اور لاکھوں کا کاروبار تھا۔ آج سب کچھ اُس کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے ایک قیمتی سوٹ زیب تن کیا تھا۔ اور تاج محل ہوٹل کے ایک چھکتے ہوئے کمرے میں سانس لے رہا تھا۔ نیچے ہال میں ایک شور سا سنائی دیا۔ وہ ہال میں آیا۔ ہال نقرئی قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ سُرخ سبز اور گلابی رنگ کی بے شمار ساریاں لہرا رہی تھیں۔ بوتلوں سے کاگ اُڑائے جا رہے تھے۔ دلکش ساز بج رہے تھے۔ چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ اُس کے گلے میں عُریاں بازو حمائل ہو گئے۔ ایک نسائی جسم کے گداز نے اُسے ایک شیریں لمس بخشا۔

وہ ناچنے لگا۔

"تمہارے حُسن میں کتنا نکھار ہے شمی!"

"سچ ——؟"

کلی نے تبسّم کیا۔ پھول نکھر آیا۔ اور اُس کا ہاتھ پُشکر کی کمر پر اور زیادہ کس گیا۔

"تم سے بھی جھوٹ؟" معنی خیز نظریں شمی کے چہرے پر جم گئیں۔

"تم کتنے اچھے ہو ڈارلنگ!"

کانوں کے آویزے ہلنے لگے۔

"ہیلو سیٹھ جی!" کولہے مٹکاتی ہوئی نیلی نیلی آنکھوں والی لڑکی اُس کے سامنے آئی۔

"ہو ڈو یو ڈو؟"

"اوکے نیڈو!" شمی کا ہاتھ اُس کی کمر سے الگ ہوا۔ اب وہاں نیڈو کا ہاتھ تھا۔ اور پھر وہ دونوں ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ نیڈو نے دو پیگ بنائے

"شوق فرمایئے سیٹھ جی"

آنکھیں مُسکرائیں۔

"آئی لو یو ڈارلنگ" جام لب تک آیا۔

"آداب عرض سیٹھ پُشکر ناتھ جی!" ایک بھاری بھرکم جسم اُس کے سامنے آیا۔

"آداب عرض اجیت بابو" پُشکر نے کرسی پیش کی۔

"پروگرام یاد ہے؟" اجیت بابو نے یاد دلایا۔

پُشکر نے پیار سے نیڈو کے تمتماتے ہوئے رخسار پر ایک ہلکی سی چپت لگائی۔ اور اجیت بابو کے ساتھ ہو لیا۔

باہر کار کھڑی تھی۔ دونوں پچھلی نشست میں دھنس گئے۔ اور کار کول تار کی چمکتی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

"مال کا کیا ہوا اجیت بابو؟"

"دس ہزار من آگیا"

اجیت بابو نے پُشکر کی ران پہ ہاتھ مارا۔

"مارکیٹ میں آگیا کیا؟"

"کل آئے گا سیٹھ صاحب!"

"بس تو ٹھیک ہے"۔

پُشکر فرطِ مسرت سے مُسکرا دیا۔

کار ایک عالی شان بنگلے کے سامنے رک گئی۔ پُشکر اجیت بابو کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے نیچے اُترا۔ اُس کے قدم زمین پہ اچھی طرح نہیں پڑ رہے تھے۔ برآمدے میں سفید روشنی بکھیرتا ہُوا لیمپ روشن ہُوا۔ سامنے سنہری بالوں والی ایک اینگلو انڈین لڑکی کھڑی تھی۔ پُشکر کے قدم ابھی تک لڑکھڑا رہے تھے۔ لڑکی نے اُسے ایک ادا کے ساتھ سنبھال لیا۔ اور تینوں اُوپر آگئے۔ نیلی نیلی روشنی میں کمرہ بہت حسین لگ رہا تھا۔ ریڈیو کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرانے لگی۔

"دیکھ ترے انسان کی حالت کیا ہو گئی بھگوان!"

"کتنا بدل گیا اِنسان!!"

"کتنا بدل ——— !!!"

"روزی ——— !" پُشکر گرجا

"ڈارلنگ ———" روزی حیرانی سے بولی۔

"ریڈیو بند کرو" دوسری گرج۔

ریڈیو چوڑیوں کی کھنک کے ساتھ بند ہُوا۔

اجیت گلاسوں میں شراب انڈیل رہا تھا۔ اور شراب کی بو کے ساتھ ایونِنگ اِن پیرس کی خوشبو شامل ہو رہی تھی۔

اُس روز ہال میں کافی جمگھٹ تھا۔ ہلکی ہلکی نیلی نیلی روشنی میں ساز بج رہے تھے۔ موسیقی کی لے کے ساتھ ساتھ قدم ڈگمگا رہے تھے۔ دور چل رہے تھے۔ پشکر کے ایک ہاتھ میں جام تھا اور دوسرے بازو پہ ایک گداز جسم۔

"بس سیٹھ جی۔" نلنی رومال سے مُنہ پونچھنے لگی۔

"اور یہ میری آنند! — آرکسٹرا کی یہ دھن۔ تم اور یہ شراب۔ تم سب ایک ہو نلنی!"

"ہیلو پوشا ڈیئر" کُرسی کھینچ کر ایک ادھیڑ مگر گول مٹول آدمی پشکر کے نزدیک آیا۔

"کہو شوکت؟"

دلاویز تبسم کے ساتھ دو ہاتھ مل گئے۔

"مال مارکیٹ میں بھیج دوں پیارے۔ لوگ مر رہے ہیں؟"

"مرنے دو شوکت — مرنے دو لوگوں کو — اتنی جلدی بھی کیا — ہاں پندرہ لاکھ نفع ہو میرا کوئی اعتراض نہیں — سمجھے پیارے — ہا ہا ہا ہا!"

"لیکن پشکر"

"لیکن وہیکن کچھ نہیں"۔

پشکر نے دو پیگ خالی کئے اور نلنی کی گود میں اپنا سر ڈال کر شوکت سے مخاطب ہوا۔

"مرنے دو شوکت لوگوں کو ـــ تم زندہ ہو ـــ ہم زندہ ہیں ـــ ہُم ـــ تم کا ہے کی فکر میں ہو .... ہاہا ـــ ہاہا ـــ ہاہاہاہا!"

"ہُم ـــ اُوں ـــ میں بہک نہیں گیا ـــ ایک سگریٹ دو!"

"یہ لیجئے!"

پانچ سو پچپن کا ٹن آگے بڑھا۔

پشکر منہ سے دھوئیں کے مرغولے نکال رہا تھا اور دھواں نلنی کے حسین چہرے پر چھا کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا۔

"کاش اِس دھوئیں کی طرح تم بھی ـــ ہُم"

اُسی وقت اُس کے قدموں پہ ایک لڑکی گر پڑی۔

"مجھے بچالو سیٹھ پشکر ناتھ جی! مجھے بچالو" یہ سیٹھ مادھو رام کی لڑکی کامنی کی آواز تھی۔

"او ہ تم ـــ مجھے معلوم تھا تم ایک دن میرے قدموں میں آؤ گی کامنی ـــ مجھ سے بھیک مانگو گی ـــ سو وہ دن آ گیا ۔ ہاہاہا!!"

آرکسٹرا پہ نغمہ بج رہا تھا ـــ بوتلیں خالی پڑی تھیں۔ نلنی اور شوکت جا چکے تھے۔

"تھپ تھپ ـــ!"

کوئی پُشکر ہی کی جانب آرہا تھا۔ بھوک سے اُس کا پیٹ ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ لگ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اور ایک زناٹے دار طمانچہ پُشکر کے گال پر آپڑا۔ وہ چونک کر بیٹھا۔ میلی اور غلیظ چادر اُس کے چہرے سے سرک گئی تھی۔ سورج کی زریں کرنیں چھن چھن کر روشن دان سے اندر آرہی تھیں۔ باہر اُس کی دمہ کی مریض ماں زور زور سے کھانس رہی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے سے باہر آیا۔ غیر شعوری طور پہ اُس کا ہاتھ اُس کے گالوں کو چھونے لگا۔ وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "یہ طمانچہ مجھ پہ نہیں۔ سیٹھ مادھو رام پر پڑا ہے جو مجھے روز ایسے سُپنے دیکھنے پر مجبور کر رہا ہے!!"

کاغذی پھول

پیاری صفیہ!

گاؤں سے شہر کیا آئی کہ مصیبت آئی۔ یہاں وہ پانپور کے زعفران کے کھیت کہاں۔ جن پیارے پیارے اور رنگ دلوز سے بھرے ہوئے کھیتوں میں تم اور میں شام کی تنہائی میں چاندنی کے مزے لوٹا کرتی تھیں۔ شہر کی بات سوچا کرتی تھیں۔ روز شہر کی بات۔ شہر کا نام ہی ہمارے دل میں ننھی ننھی دھڑکنیں پیدا کرتا۔ آنکھوں میں ٹھنڈک سی آجاتی۔ اور پھر ہم کتنے ہی حسین خوابوں میں کھو جایا کرتے۔ خواب جن میں رنگ اور رس ہوتا ہے۔ کلیوں کا شباب اور پھولوں کا نکھار ہوتا ہے۔ اور ان ہی خوابوں کی دنیا میں تمہیں شہر آنے کی کتنی تمنائیں اور آرزوئیں تھیں۔ اور ان تمناؤں اور آرزوؤں پر اُس دن اور زیادہ نکھار آیا جب ہمارے گاؤں میں وہ پیاری البیلی سی لڑکی فاطمہ آئی تو تم نے اُس سے شہر کی کتنی باتیں پوچھیں۔ تمہیں اُس کے بال بنانے کا انداز کتنا پسند آیا۔ اور جب تمہیں معلوم ہوا کہ وہ شہر میں گرلز کالج میں پڑھتی ہے تو تمہاری آرزوؤں اور اُمنگوں میں کتنا جوش آیا۔ تمہاری بے چینی اور بے قراری کس قدر بڑھ گئی۔ اور خود میری بھی یہی چاہ رہی تھی کہ میرے پر لگ جائیں اور میں ابھی اُڑ کر گرلز کالج پہنچ جاؤں۔ اُس گرلز کالج میں، جہاں ہمیں معلوم تھا آزادی ہے اور اس آزادی میں ہم بہت کچھ سیکھ جائیں گی اور پھر ہمارا شمار دنیا کی بڑی بڑی عورتوں میں ہوا کرے گا۔ یہی تمنائیں اور تمناؤں کے

دلفریب رنگ تھے جو ہمیں گرلز کالج پہنچ جانے کے لیے بے قرار کرتے، تڑپاتے، ترساتے۔ لیکن تم کتنی اچھی ہو جو یہاں آنے کی تمنا لیے ہوئے بھی یہاں نہ آ سکیں۔ اور میں کتنی بُری ہوں جو اِس اندھیرے غار میں جا گری۔ یہاں اندھیرے اور تاریکیاں ہیں۔ تاریکیاں جن میں نُور کی ایک جھلک تک نہیں۔ اور اندھیرے جن میں روشنی کی ہلکی سی کرن بھی نہیں پہلے دِن جب میں یہاں پہنچی تو مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے میں ہوا میں پرواز کر رہی ہوں۔ اور پرواز کرتے کرتے تختِ سُلیمان سے بھی اُوپر جا پہنچی ہوں۔ شنکر آچاریہ سے بھی بُلند اُڑ رہی ہوں۔ اور مجھ پر سُرخ سُرخ گل لالوں کی بارش ہو رہی ہے۔ مجھے موتیوں اور ہیرے زمرّدوں کے ہار پہنائے جا رہے ہیں۔ مجھے دُنیا بھر کی عزّت اور بڑائی بخشی جا رہی ہے اور اُس وقت مجھے تمہاری یاد آ جاتی تو سچ مچ میں تمہاری بدقسمتی پر رو دیتی۔ مجھے کتنا افسوس ہوتا۔ کاش ہم دونوں ساتھ ساتھ ہوتیں۔ اور ساتھ ساتھ رہ کر زندگی کے مزے لوٹتیں۔ لیکن ـــ آخر کار میں یہ سب کچھ برداشت کرتے کرتے گرلز کالج کی رنگینیوں میں داخل ہوئی۔ یہاں مجھے رنگینیاں ہی رنگینیاں نظر آئیں۔ پانپور کے زعفران کے کھیتوں میں تو بس ایک ہی رنگ ہوتا ہے مگر یہاں۔ یہاں تو قوسِ قزح سے زیادہ رنگ ہیں۔ شوخ اور دلفریب رنگ۔ رنگ جو دل کھینچ لیتے ہیں۔ آنکھوں میں اپنا عکس چھوڑتے ہیں اور پھر انسان ان ہی رنگوں کا شیدائی اور متوالا بن جاتا ہے۔

یہ سب رنگ مجھے پہلے ہی دن گرلز کالج کے رنگ برنگ پھولوں بھرے پڑے باغ میں نظر آئے۔ اُف لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ اتنی ساری لڑکیاں تم نے پانپور میں زندگی بھر بھی نہ دیکھی ہوں گی اور پھر اُن کی ترچھی نگاہیں اور بانکی ادائیں۔ آبشار کی طرح گرتی ہوئی زلفیں ـــ زلفیں جو یا تو کالی ہوتی ہیں۔ کالی کالی گھٹائیں۔ یا سنہری سونے

کے باریک باریک تار۔ کون ہے جو اِن تاروں میں اُلجھ کر نہ رہ جائے۔ کون ہے جس پر کالی گھٹا نہ برسے۔ اُن کے ہونٹوں کی سُرخی رخساروں کی تمتماہٹ، گرمی اور نرمی دیکھنے کی چیز ہے۔۔ اُن کے نازک نازک جسموں میں گلاب کے غنچوں کی سی ہلکی ہلکی سرخی اور ہیزل کی نازک نازک ڈنٹھلوں کی سی نرمی ہوتی ہے۔ اور پھر ان یاقوتی اور سیمیں جسموں کے لباس۔۔ لباس پہننے کا ڈھنگ کتنا صاف سُتھرا ہوتا ہے۔ اس میں کتنی فنکاری ہوتی ہے۔ یہ ہم نہیں کہ سامنے سے فرن اُٹھایا اور پہن لیا۔ ایک ہی بار دو دو مہینوں کے لئے بال بنا رکھے اور کام ختم۔ یہاں کی دنیا ہی نرالی ہے۔ یہاں فرن کہاں۔ ریشم کے قیمتی قیمتی بلاوز اور فراک ہوتے ہیں۔ شلوار اور غرارے ہوتے ہیں۔ ہوا میں لہراتی ہوئی نیلی نیلی ساریاں ہوتی ہیں۔ پیاری! یہاں لڑکیاں ننگے سر بھی چلتی ہیں اور سب سے تعجب کی بات تو یہ ہے کہ یہاں کی مُہذّب لڑکیاں پتلون بھی پہنتی ہیں۔ اِن پتلونوں کی نوک، پلک درست کر کے مٹک مٹک کر چلتی ہیں۔ پیاری یہ وہ مٹکنا نہیں جو ہم پنگھٹ پر پانی لے جانے والی لڑکیوں کا دیکھا کرتے ہیں۔ جن کے تنگ موری والے کھدر اور موٹی سی معمولی چھینٹ کے پاجامے گھٹنوں سے اُوپر سلے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہاں تو بوٹ کی نوک تک یہ رنگ برنگ کے پتلون لہراتے ہیں۔ اور پھر اِن پتلونوں میں مٹکنا اور نازک نازک ٹانگوں کا تھرکنا دیکھنے کی چیز ہے ۔۔ اِن لڑکیوں میں تو مجھے خوب صورتی ہی خوب صورتی نظر آئی۔ یہ لڑکیاں تو اُن خوب صورت حوروں سے بھی زیادہ خوب صورت ہیں جن کی تعریفیں مسجد کے امام صاحب سے سُن سُن کر تمہیں جنّت دیکھنے کی بڑی آرزو تھی۔ اِن حوروں کو دیکھ کر میں سوچتی کاش! تم اِس جنّت میں آ کر اِن حوروں کو دیکھ لیتی۔ پھر تمہارے دل میں جنّت دیکھنے کی

آرزو نہ دھڑکتی ۔ ! دیکھو تو میں بھی کیا کیا کہہ گئی ۔ کہنا تو یہ تھا جب میں پہلے دن ان پریوں کے دیس میں آپہنچی تو میں ٹھٹک اور جھجک کر رہ گئی ۔ ٹھٹھک اسی لئے گئی کہ میں نے اتنی ساری رنگ برنگی لڑکیاں پہلی بار دیکھی تھیں ۔ اور جھجک اسی لئے گئی کہ میرے پاس اُن جیسا زرق برق لباس نہ تھا ۔ آخر گاؤں کی جو تھی ۔ میں تو وہی بھیا کی شادی پہ سلوائے ہوئے فراک میں تھی اور اب اُس کا بھی وہ رنگ نہ رہا تھا جو پہلے تھا ۔ میں تو بہت خجل ہوئی شدہ رہی کہ ۔ اور یہ لڑکیاں بھی تو پہلے دن مجھے بہت کم پوچھتی تھیں ۔ اور پوچھتی بھی کیوں ؟ میرا اُن کا مقابلہ ہی کیا تھا ۔ جس طرح گاؤں اور شہر کے مکانات میں کافی فرق ہے ۔ گاؤں اور شہر کے کھانے پینے میں فرق ہے ۔ اسی طرح گاؤں اور شہر کے انسانوں میں بھی فرق ہوتا ہے ۔ اور پھر پانپور کی لڑکی اور گرلز کالج کی لڑکی میں تو فرق ہی فرق ہے پیاری ۔ اسی لئے تو وہ میرے ساتھ بہت کم چلتیں ۔ یہاں کی ریت ہی میں نے عجیب دیکھی ۔ ہر لڑکی اُس لڑکی کے ساتھ چلنا پسند کرے گی جو لباس اور دولت میں اُس سے بڑی ہو اور وہ لڑکی اُس سے بھی اونچی کسی اور لڑکی کے ساتھ چلے گی ۔ اور پھر یہ کشمکش جاری رہتی ہے ۔ لیکن اِس سے تم یہ نہ سمجھ لینا یہاں کوئی غریب لڑکی پڑھتی ہی نہیں ۔ وہ بھی تو پڑھتی ہیں ۔ لیکن خود کو وہ دوسروں کی نظروں میں غریب محسوس ہونے نہیں دیتیں ۔ لباس اچھا پہنتی ہیں ۔ چاہے گھر میں وہ فاقے سے ہی کیوں نہ رہتی ہوں ۔ وہ آدھا پیٹ کھا کر کوڑی کوڑی اور پیسہ پیسہ بچائیں گی ۔ لیکن لباس قیمتی پہنیں گی ۔ اور پھر بڑے آدمیوں کی دولت مند لڑکیوں کے ساتھ ریس کریں گی ۔ غرض اُس کے ہر ڈھنگ، طرز اور طریقے کی نقل اُتاریں گی ۔ یہ نقل اُتارنے کا مرض تو مجھے بھی ایک حد تک لگ گیا ہے ۔ اگر نہ لگتا تو پھر میں کالج نہ آتی ۔ جیل خانے میں

آجاتی ۔۔ پھر تو مجھ سے اپنا ہی کون ؟ لباس جدید فیشن کا نہ ہو تو کیا فرق پڑتا ہے۔ تم
تمہارے ساتھ چلے۔ اس لیے نقل یہاں بالکل عقل کے مطابق کی جاتی ہے ۔۔ یہ میرا
یہاں پہلا ہی دن تھا کہ میں لائبریری میں پہنچی۔ یہاں کتابوں کی بڑی بڑی الماریاں ہیں۔ اتنی
ہی بڑی لائبریری ہے یہ جتنا تمہارا گھر ہے۔ کتابوں کے انبار، رسالوں کے ڈھیر لیکن سبھی
لڑکیاں تو سستے قسم کے رومانی ناول پڑھتی ہیں۔ اور پھر گندی گندی باتیں وہ اس
بے باکی سے کرنے لگتی ہیں کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتی ہوں۔ لیکن دریا میں رہ کر مگر مچھ سے
بیر کون کرے ۔۔ یہاں میرے کانوں نے پہلی بات سنی وہ تھی عشق اور محبت کی بات۔ وہ
محبت نہیں پیاری جو تیری میری محبت ہے۔ بہن بھائی کا یا بھائی بہن کا پیار نہیں پیاری۔ یہ کچھ
اور ہی پیار ہے ۔۔ یہ پیار یہاں بہت ہوتا ہے ۔۔ پیار کرو۔ پیار کی بات کرو اور جیو۔
ورنہ ڈوب مرو کہیں چلو بھر پانی میں ۔۔ یہاں تو اور بھی عجیب عجیب کھیل تماشے ہوتے ہیں
اُس دن جب میں چار بجے کالج سے نکلی تو کیا دیکھتی ہوں، کوئی کالج کا لڑکا کتابیں تھامے
میرے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ میں پہلے ڈری تو نہیں۔ سمجھا یہ میرے پیچھے پیچھے تھوڑا
ہی چل رہا ہے۔ ابھی ہٹ کر اُس طرف کو جائے گا۔ لیکن پیاری جب وہ بالکل میرے
ساتھ ساتھ چلنے لگا تو میری روح ہی نکل گئی۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ہاتھ
اور ٹانگوں میں عجیب سی مردنی چھا گئی۔ اس سے پہلے تو میں یہ سوچ رہی تھی، اب
کالج کے لئے کیسے کیسے کپڑے بنواؤں گی۔ وہاں کس طرح چلا کروں گی۔ اور کیونکہ
وہ مجھے کوئی اجنبی پرائی لڑکی نہ سمجھیں۔ لیکن وہ سب خیالات اُس وقت ریت کے
محل کی طرح گر پڑے، جب وہ لڑکا میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میں بس اسٹینڈ
پر پہنچی تو وہ میرے ساتھ ہی تھا۔ میں لال چوک میں آئی تو وہ ساتھ ہی لگا رہا۔ سینما کی

وجہ سے لال چوک میں کافی بھیڑ تھی۔ بھیڑ میں سے کسی نے اسے پکارا تو وہ اس کے پاس چلا۔ میری جان میں جان آئی۔ میں نے ٹھنڈی سانس بھری اور مائیسمہ کی طرف مڑی۔ میں ابھی کچھ ہی دور پہنچی تھی کہ پھر وہی لڑکا میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اب اس کے ساتھ دوسرا بھی کوئی لڑکا تھا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ کیا کیا کہہ رہے تھے میں تو کچھ بھی نہیں۔ میں چل رہی تھی لیکن اُن میں سے اب ایک لڑکا میرے بالکل ساتھ ساتھ چلنے لگا اور گانے لگا۔ "مانا کہ ہم غریب ہیں۔ دل تو نہیں غریب ہے۔ دولت تو آزمائی ہے دل آزما کے جا۔ او بلبل دل آزما کے جا۔ او بلبل دل آزما کے جا۔ او بلبل دل آزما کے جا۔۔۔۔ او بلبل!" اور میں مرگئی پیاری۔ میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ برقعے میں پسینے سے شرابور ہو رہی تھی۔ اور پھر نہ پوچھو کہ میری وہ رات کیسے گذری۔ جیسے میں جنوں اور بھوتوں کے چنگل سے بچ کے آئی تھی۔ جیسے کسی گہرے اندھیرے کنوئیں سے مجھے نکالا گیا تھا۔ جیسے سمندر کی تہہ سے دم گھٹتے گھٹتے مجھے بچایا گیا تھا۔ اتنی خوف زدہ ہوئی تھی میں۔ پھر کالج کے ماحول میں رس بس کے مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہوئیں۔ اس سے بڑی بڑی باتیں اور شرارتیں یہاں ہوتی ہیں۔ اور یوں ہوتی رہتی ہیں جس طرح ہمارے گاؤں کا وہ چشمہ دن رات پانی اُگلتا رہتا ہے اور ایک پل کے لئے بھی سوکھا اور خاموش نہیں رہتا۔ یہاں کی دنیا ہی عجیب ہے۔ ہمارے کالج کے پیچھے کچھ دائیں جانب تو ایک اور کالج ہے۔ نام تو بار بار دہرا کر بھی مجھے یاد نہیں رہتا۔ لیکن ہے وہ لڑکوں کا کالج۔ اب دیکھو یہ لڑکے کتنے شریر ہیں۔ انہوں نے ہمارے کالج کی دیوار میں دو چار سوراخ کر ڈالے ہیں۔ صبح کے دس بجے سے لے کر شام کے چار بجے تک اُن ہی سوراخوں میں سے ہمیں جھانکا

کرتے ہیں۔ کھیل کے وقت جب ہم باہر نکلتے ہیں تو ان سوراخوں کا عجیب حال ہوتا ہے۔ آٹھ آٹھ آنکھیں ایک ہی وقت ایک سوراخ پر لگ جاتی ہیں۔ جیسے دیوار کے سوراخ نہ ہوئے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں دوربینیں ہوتیں۔ لیکن پیاری اس سے تمہیں یہ خیال نہ آنا چاہیئے کہ بس لڑکے ہی شریر ہیں۔ جو اس طرح سے شریف لڑکیوں کو ستاتے ہیں۔ یہ تمہاری غلطی ہے۔ میں کالج کی ہر ایک لڑکی سے واقف ہو چکی ہوں۔ یہاں کی لڑکی تو اس وقت کو لچے مٹکاتی، آنکھیں نچاتی، بال لہراتی اور نقرئی قہقہوں کے طوفان بکھیرتی ہوئی دلربانہ انداز سے چلے گی۔ جب اسے معلوم ہو کہ سوراخوں کے پیچھے سے اسے بہت سارے لڑکے دیکھ رہے ہیں۔ یہاں تو حسن اور عشق کا سنگم ہے ہاں ایک بات میں تمہیں ان لڑکیوں کی بتاؤں۔ تمہیں تو عجیب ہی معلوم ہو گی۔ لیکن تم سن لیے جب یہ لڑکیاں دیکھتی ہیں کہ ان سوراخوں میں سے کوئی انہیں جھانکتا نہیں تو وہ کچھ سست سی پڑنے لگتی ہیں۔ چہرے کی رنگت اڑسی جاتی ہے اور پھر وہ نظریں بچائے دھیرے دھیرے دبے پاؤں دیوار کے پاس پہنچ کر سوراخ میں سے جھانکتی ہیں۔ جب وہاں کوئی نہیں ہوتا تو غمگین اور مایوس ہو جاتی ہیں۔ جیسے ان کی زندگی کی ساری رنگینی اور تازگی چھین لی گئی ہو۔ شباب کی ساری مٹھاس اور رس چوس لیا گیا ہو۔ یہ یہاں کی شوخ و شنگ لڑکیوں کی فطرت ہے۔ ہم گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیاں اسے کیا جانیں۔ یہاں ایک لڑکی ہے تھرڈ ایر میں پڑھتی ہے۔ نام ہے اوما۔ وہ ایک دن مجھ سے یوں ہی اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگی۔ یہی کہ کالج کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے۔ تم کس طرح کا عشق پسند کرتی ہو۔ اور اس طرح کی اور بہت ساری باتیں پوچھنے لگی۔ بھلا میں کیا جانوں ان ہتھکنڈوں کو۔ میں نے کہا

میں تو یہ باتیں آج پہلی بار سُن رہی ہوں۔ میں کیا جانوں ان باتوں کو"۔ میری بات سُن کر وہ ہنس پڑی۔ اور لگی شاعری میں بات کرنے۔ کہیں دل نہ لگانا۔ کہیں جال میں نہ آنا، کہیں پچھتانا نہیں"۔ پھر میری ٹھوڑی اپنی ہتھیلی میں لے کر کہنے لگی۔ "دیکھو نرگس! تم ابھی اس دُنیا میں نئی نئی آئی ہو۔ جب ہی تو اتنی بے خبر معلوم ہوتی ہو۔ یہ دنیا ہی نرالی ہے۔ اسی لئے ذرا پھونک پھونک کے قدم رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ گر کر انسان کسی کام کا نہیں رہتا۔ اب ایک بات میں کہوں گی۔ یہ کالج کے لڑکے ہیں نا، انہیں خوب نچاؤ۔ اتنا نچاؤ کہ یہ خود ہی ناچ ناچ کر گر پڑیں۔ اور پھر تماشہ دیکھیے گی میری نرگس ورنہ یہ جنٹلمین تو بڑی اکڑ دکھاتے ہیں۔" پھر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے چل دی۔ پھر کشوری مجھ سے ملی۔ اِس سے پہلے میں اُسے جانتی نہ تھی۔ لیکن ہے بہت اچھی لڑکی۔ دوپٹہ کبھی سر سے ڈھلکنے ہی نہیں دیتی۔ کالج سے نکلتے وقت آنکھیں جھکی جھکی ہی رہتی ہیں۔ جیسے کوئی اُس کی جوانی چھین لے۔ مجھ سے بہت ہی پیار سے کہنے لگی۔۔۔ "نرگس بہن۔ تم یہاں اِن لڑکیوں کی باتوں میں نہ آنا۔ ان کے اِس رنگ و روپ پر نہ جانا۔ یہ سب کھوٹ اور بناوٹ ہے۔ اُنہیں تو بس ٹیپ ٹاپ کی فکر ہے اور بس۔ لیکن ہم تو یہاں پڑھنے آئے ہیں۔ اس لئے اپنے کام سے کام رکھنا چاہیئے تم اوما سے ملتی ہو۔ یہ تم بہت بُرا کرتی ہو۔ اس لئے کہ اوما کی جو پارٹی ہے اُس کا کوئی کریکٹر نہیں۔ یہ سب کچھ میں تمہیں ایک بہن کے ناطے کہہ رہی ہوں۔ تم جاکے اُوما سے کہہ تو نہ دینا۔" کشوری مجھ سے اکثر ملتی رہی۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ یہاں کشوری کی ہم خیال اور بھی بہت ساری لڑکیاں ہیں۔ جو شریر لڑکیوں سے راہ ورسم نہ بڑھا کر اپنے کام سے کام رکھتی ہیں۔ پڑھتی ہیں اور دِل لگا کر پڑھتی ہیں

نسرین کشوری کی فاسٹ فرینڈ ہے۔ اس لیے میری بھی دوست بن گئی ہے۔ بہت پیاری پیاری باتیں کرتی ہے اور صورت سے بھی تو پیاری ہی معلوم ہوتی ہے۔ اتنی معصوم ہے جتنا ایک ننھا بچّہ۔ ایک دن وہ موڈ میں آ کر مجھ سے کہنے لگی ــ یہ کالج کی لڑکیاں تو اکثر یوں ہی بدنام ہو جاتی ہیں۔ ساتھ والے کالج کے لڑکے بہت شریر ہیں۔ جوں ہی ہمارے کالج کی کسی لڑکی کا نام معلوم ہوا بس لکھ مارے ایک بے نام خط۔ جس میں واہی تباہی لکھ جاتے ہیں۔ کارڈ تو ضروری ہے یہاں ساری لڑکیاں پڑھ لیں گی۔ اور پھر شور ہر چہا، ہنگامہ اور یہ معصوم لڑکی اتنی بدنام ہو جاتی ہے کہ منہ چھپانے کو جگہ نہیں ملتی اُسے" نسرین کی یہ بات سچ ہے۔ یہاں کی اکثر لڑکیاں تو ان نیبرڈں کا شکار ہو چکی ہیں۔ لیکن شکاریوں کے نام تک اُن بچاریوں کو معلوم نہیں۔ اُن لڑکوں کو جیسے شرم و حیا چھو کر بھی نہیں گئی ہے۔ کسی کی عزّت و آبرو کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے۔ راہ چلتے ہم لڑکیوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ خاموش رہو تو ہمارے پیچھے پیچھے فلموں کے ڈائیلاگ بولنے لگتے ہیں۔ ہائے میری جان! میں تو مر گیا رے ــ چشمِ بد دور ــ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں ــ اب کچھ کہو تو اونچی آوازمیں آوازے کسنے لگتے ہیں اور ہم تنگ آ جاتے ہیں۔ اب تو پولیس اُن شریر لڑکوں کو گرفتار بھی کرنے لگی ہے۔ لیکن اُن کی خصلت کہاں جائے۔ کسی نہ کسی طریقے سے پریشان کر ہی لیتے ہیں۔ پیاری! یہ شہر کی پریشانیاں کچھ نہ پوچھو۔ صبح پریشانی اور شام پریشانی۔ روشنی میں بھی اور اندھیرے میں بھی ــ جدھر جاؤ، جہاں دیکھو پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں ــ!

اور اُس دن تو میں بہت پریشان ہوئی۔ کیا ہوا۔ ہم شالیمار باغ ایکس کرشن

کھو گئے۔ مصیبت تو یہ آئی اوما میرے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مجھے اپنے ساتھ گھسیٹنے لگی کیسے پیچھا چھوڑتی۔ باغ کے اُوپر والے سائڈ کو جاتے ہوئے کہنے لگی:۔

"اب دیکھو نرگس مرزا! اب ایک فلم کا سین دکھاتی ہوں تمہیں!"

میں تو حیران اور پریشان ہو لی۔ سمجھ گئی کوئی شرارت سوجھی ہے اُسے۔ اُس نے گلاب کے دو پھول توڑ دے۔ اور اس طرف کو اشارا کرنے لگی جہاں دو لڑکے مزے میں بیٹھے پھولوں کی کیاریوں کے ساتھ کھیل رہے تھے ۔۔۔ اُوما ساری کو ہوا میں لہراتی، خوشی سے جھومتی چوڑیوں کی کھنک سے ایک بار پھر بول اُٹھی۔

"اب دیکھ تو نرگس مرزا!"

میں خاموش رہی۔ وہ زور زور سے باتیں کرتی رہی۔ اور پھر اُن لڑکوں کی طرف مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لے چلی۔ اُوما قہقہے بکھیرنے لگی۔ دونوں لڑکے ہمیں گھورنے لگے ۔۔۔ اوما نے چپکے سے میری کلائی پر چٹکی لی۔ پیاری! میں تو مری جا رہی تھی۔ لیکن اوما ۔۔۔ وہ تو قہقہے بکھیرتی، بالوں کو ساتھ ساتھ سجاتی، بل بل پیچ بل کھاتی ہوئی چل رہی تھی۔ پھر اُس نے لڑکوں کی طرف ایک مسکراتی اور شوخی سے بھری نظر پھینک دی۔ اور ہاتھ سے گلاب کے دونوں پھول نیچے سبزے پر گرا دئے۔ دونوں لڑکے آئے اور ایک ایک پھول اُٹھا کر سونگھتے رہے۔ پھر بڑے پیار سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ میں تو ڈر اور شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی کہ یہ کون سی مصیبت آئی ۔۔۔ وہ کیسے گناہ کئے تھے جو یہ دن اور یہ وقت دیکھنا پڑا۔ وہ دونوں بہت ہی بے باکی سے ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جیسے ہم ۔۔۔! اُوما نے ایک بار اور زور سے میری کلائی کو دبایا۔ سینہ تان کر دونوں

لڑکوں سے مخاطب ہوئی۔

"بڑے بدتمیز ہیں آپ ۔ شرم نہیں آتی تمہیں !"

"اوہ اتنا غصہ !"

"شٹ اپ"

اُوما چیخی ۔

پھر تو بہت ساری لڑکیاں اُوما کا شور سُن کر جمع ہو گئیں ۔ اور پھر نہ پوچھو اُن دولوں کی کیا گت بنی ۔ جو مار پڑی ۔ جو روسیاہی ہوئی ۔ وہ خدا کسی دس نمبر بدمعاش کی بھی نہ کرے ۔ اُن کی کون سُنتا ۔ سبھی لڑکیوں نے سینڈل اُٹھائے اور تڑاخ تڑاخ ـــــ !!

لیکن حقیقت تو میں ہی جانتی تھی ۔ اُوما بھی لڑکیوں کے سامنے لگی اپنی معصومیت جتانے اور چُپکے سے میرے کان میں کہا ۔

" دیکھ لیا نہ فلم "

یہ حالت ہے یہاں کی پیاری ! ـــ یہی فلم دن رات چلتے رہتے ہیں ۔ یہاں سب فراڈ ہے ۔ سب دھوکا ہے ۔ سب کچھ فریب ہے ۔

پھول ہیں مگر خوشبو اُڑ چکی ہے ۔

کاغذ کے پھول !!

رنگ ہے ۔ لیکن مہک نہیں ۔ بناوٹ ہی بناوٹ ۔ کھوٹ ہی کھوٹ ۔ جھوٹ ہی جھوٹ ۔ یہاں کی زندگی کی سچی رنگینیاں ہی مرچکی ہیں ۔ اِن سے ریشم ، غازہ اور پوڈر چھین لو تو یہ کچھ بھی نہیں رہتیں ۔ کچھ بھی تو نہیں ۔

اُس چرواہی لڑکی کی معصومیت اِن میں کہاں جو گود میں بھیڑ کا بچّہ لیئے پانپور میں ہم سے مِلا کرتی تھی۔ یہاں وہ سرسبز و شاداب کھیتوں کا رُوپ کہاں؟ جن میں ہم آزادی سے پھرا کرتی تھیں۔

وہ ندیاں یہاں کہاں، جن کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کے ہم دُنیا بھر کی باتیں کیا کرتی تھیں! یہاں کچھ بھی تو نہیں!

شہر شہر ہے۔ اور گاؤں گاؤں!

اندھیرا اور اُجالا!!

تمہاری اپنی
نرگس

وادی کی رانی

ایک اور بار نیچے وادی سے ٹھک کی آواز آئی، اور اکبر خان سرہانے سے بندوق اُٹھا کر دروازے پر آ گیا۔ وہ نیچے وادی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہاں چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وادی سے رات کی تاریکی میں ایک چھوٹا سا سایہ اُبھرنے لگا۔ اکبر خان کی انگلیاں پھرتی سے بندوق کی لبلبی پر پھرنے لگیں۔ سایہ اور اُبھرنے لگا۔ اکبر خان فائر کرنے کو ہی تھا کہ سایہ اچانک ایک جگہ آ کر رُک گیا اور صرف ٹاؤں ٹاؤں کی آواز اکبر خان کے کانوں میں سما کر رہ گئی۔ اور پھر اُس کی تجربہ کار انگلیاں بندوق کی لبلبی سے ہٹ گئیں۔ وہ کئی راتیں اسی طرح گذار چکا تھا۔ چند گھنٹے سو کر چند گھنٹے جاگ کر یا ساری ہی رات جاگتے جاگتے۔

پہلگام کی اس پہاڑی پر صرف اکبر خان کی ہی ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی تھی۔ کچی پکی اینٹوں سے بنی ہوئی ایک پرانی سی جھونپڑی۔ پہاڑی سے نیچے وادی تک ویسے بہت کم فاصلہ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں نے یہ فاصلہ بڑی حد تک بڑھا دیا تھا۔ وادی کے سب لوگ اس فرق کو محسوس کرتے تھے۔ بے شک اُن کی نگاہوں میں یہ طویل اور پیچ دار راستہ تھا۔ لیکن اکبر خان کی بڑی بڑی اور گول گول آنکھوں میں نہ تو یہ راستوں کے پیچ ہی دکھائی دیتے تھے اور نہ ہی وہ اسے ایک لمبی راہ تصور کرتا تھا۔ وہ جس وقت پہاڑی سے

نیچے وادی میں اُترتا تو ایک شان سے سینہ تانے ٹھپ ٹھپ اُترجایا کرتا تھا — اور پہاڑی پہ چڑھتے وقت بھی اسی شان سے قدم بڑھاتا۔ کتنی سکت تھی اُس کی ٹانگوں میں — کتنی طاقت تھی اُس کے بازوؤں میں۔ رخساروں کی سرخی میں پہاڑی پہ چڑھتے اُترتے دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ اور جوان جسم میں طاقت کا اُبلتا ہوا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا تھا۔

میں پہلگام میں چار سال سے رہ رہا تھا۔ اور ان چار برس میں، میں پہلگام سے متعلق بہت سی کہانیاں مکمل کر چکا تھا۔ لیکن اکبر خان کی کہانی۔ یہ کہانی مجھے عجیب سی لگ رہی تھی۔ کبھی ادھوری اور کبھی مکمل۔ ان خاکوں میں کچھ رنگ شوخ تھے اور کچھ مدہم۔ اس کے متعلق میں سوچتا رہتا لیکن ذہن میں دھندلے دھندلے نقش آ کر پھر غائب ہو جاتے۔ اُن دنوں میں پہلگام کے ڈاک بنگلے میں اکثر اوقات آدھی آدھی رات تک نہیں سویا ہوں۔ دن کو بھی میری نگاہیں اکبر خان کے تعاقب میں لگی رہتی تھیں اور رات کو بھی ڈاک بنگلے کے اُوپر والے کمرے کی کھڑکی سے میری نظریں اُس کی پہاڑی پر کی جھونپڑی کو تاکا کرتی تھیں۔ جہاں کبھی دستے کی روشنی ہوتی تھی اور کبھی گھپ اندھیرا۔ کبھی نو بجے سے پہلے ہی چراغ بجھا کرتا تھا اور کبھی آدھی آدھی رات تک جلتا ہی رہتا۔

"یہ آدھی رات تک یہاں پہاڑی پہ کے مکان میں روشنی کیوں جلتی رہتی ہے۔؟"

میں نے ایک رات چوکیدار سے پوچھا۔ اس سے پہلے میں نے اُس سے پہاڑی سے متعلق بہت سے سوالات کئے تھے۔ لیکن اُس کے ادھورے ادھورے جوابات سے میری تشنگی بجھتی نہیں بلکہ اور بھی بڑھ رہی تھی۔ میں نے کئی بار اپنے اس سوال کو دہرایا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس وقت آدھی رات ہے۔ باہر سردی ہے اور بڈھا چوکیدار اپنا گھر بار چھوڑ کر سردی سے ٹھٹھرا سمٹا برآمدے کے کونے میں ایک میلی اور جگہ جگہ پیوند لگی ہوئی

لحاف میں دبک کر نیند کی تلاش میں ہے۔ نیند کی وجہ سے اس کے پپوٹے بھاری بھاری سے لگ رہے تھے اور جب اس کی یہی بھاری بھاری آنکھیں حسرت سے میری آنکھوں سے ٹکراتی تھیں تو اُن میں صرف ایک سوال تیرتا رہتا تھا۔

"بابو آپ مجھ بوڑھے کی آنکھوں سے نیند کیوں چُراتے ہیں؟"

اس بات کو سمجھتے ہوئے میں نے کئی بار ارادہ کیا کہ اب بوڑھے کو نہ ستاؤں گا لیکن پھر بھی سوال میری زبان اگل کے رہ جاتی اور میں بوڑھے سے کیدار سے اس کے جواب کے لیے اصرار پر اصرار کئے جاتا تھا۔

"بابو میں کھڑکی بند کر دیتا ہوں اور پھر بتا دیتا ہوں آپ کو۔ ہاں سب کچھ بتا دوں گا سب کچھ۔"

وہ اُٹھا کھڑکی بند کی۔ کونے میں رکھا ہوا حقہ بستر کے نزدیک لے آیا اور کانگڑی میں دکھی ہوئی آگ کو پھونک کر تیز کرنے لگا۔ جب وہ چلم میں تمبا کو بھر چکا اور زور سے دو چار کش کھینچے تو اپنی پلکوں کو اوپر اُٹھا کر بولا۔

"ہاں تو بابو یہ اکبر خان ہے نا وہاں۔"

"ہاں ہاں وہ تو میں جانتا ہوں لیکن یہ تو بتاؤ وہاں آدھی......"

"بابو وہ شرابی ہے۔ پکا شرابی ہے۔ دن کو بھی پیتا ہے اور رات کو بھی"

"لیکن صورت سے تو وہ شرابی نہیں لگتا"

"خوبصورت چھبیلا ہے بابو۔ موٹا تگڑا۔ اس لئے شرابی نہیں دکھائی دیتا۔ ورنہ بابو وہ شہر سے شراب منگواتا ہے۔"

"لیکن پیسے کہاں سے آتے ہیں عیاشی کے لئے۔ کام تو وہ"

"ہاں بابو کام تو وہ کچھ کرتا نہیں - لیکن ہے کافی پیسہ والا آدمی - مگر پروہ نانبائی کی
دکان ہے نا - وہ حبیب صوفی کی دکان"

"ہاں ہاں جانتا ہوں اُسے" میں جلدی سے بولا -

"تو حبیب صوفی ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ اکبر خان کا بینک میں بہت روپیہ پیسہ ہے -
وہی نکال کے کھاتا ہے - اور پھر ایک دن حبیب صوفی ہی سے مجھے معلوم ہوا کہ اکبر خان
کا کوئی بھائی پنجاب میں ہے جو اُسے روپے پیسے کے علاوہ کپڑے بھی بھیج دیتا ہے -
بس بابو اب مجھے نیند آرہی ہے -" وہ اُٹھا اور تحفہ وہیں کونے میں رکھ کر لحاف
میں دبک گیا -

اس رات کے بعد میں نے اکبر خان کے متعلق اور زیادہ سوچنا شروع کیا - میں اُس سے
خود ملنا چاہتا تھا - اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا - لیکن میری یہ خواہش بہت مدت تک اندر
ہی اندر دب کر رہ گئی - وادی کے تو سب لوگ اکبر خان سے ڈرتے تھے - کیوں کہ اس کے
پاس ایک چمکیلی بندوق تھی اور بندوق سے زیادہ لوہے سے بھی سخت جسم اور پھر جسم سے بڑھ کر
بارعب چہرہ - اس لئے بھی مجھے اُس سے ڈر سا لگ رہا تھا - سب جانتے تھے کہ اکبر خان
شرابی ہے - اس لئے سب اُس سے ڈرتے تھے - سب جانتے تھے کہ اکبر خان کوئی کام
نہیں کرتا - اس لئے بھی وہ اُس سے ڈرتے تھے - جب کبھی آس پاس کے کسی گاؤں میں
چوری کی واردات ہوتی تو سب اکبر خان پر ہی شک کرتے - اس لئے اُس کے وادی میں داخل
ہونے کے وقت کسی بھی لڑکی کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی اجازت نہ تھی - اور اگر بھولے سے
کوئی لڑکی ایسا کر بھی لیتی تو وادی کے سب لوگ اُسے بے حیا تصور کرنے لگتے -

ایک دن بہت سویرے ہی ڈاک بنگلے کی طرف آرہا تھا کہ دور سے پہاڑی سے

نیچے میدان میں مجھے کچھ آدمی بیٹھے دکھائی دیئے۔ میں نزدیک آیا۔ میں نے دیکھا اکبر خان کے ارد گرد وادی کے پانچ سات چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے ہیں۔ اکبر خان درمیان میں بیٹھا تھا۔ ایک ہاتھ میں بندوق اور دوسرے ہاتھ میں سر کی پگڑی، جس سے وہ اپنی بندوق صاف کر رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بچہ اپنے فراک کا دامن ہاتھ میں لئے بندوق کو صاف کرنے لگتا۔ تو اکبر خان ہنس کر بول اُٹھتا ـــــ

"خو تم ہمارا بندوق خراب کرتا" اور پھر محبت سے اپنا ہاتھ بچے کے سر پہ پھیر لیتا تھا۔

میں اور نزدیک آیا اور اکبر خان کو کئی زاویوں سے دیکھنے لگا۔ اسی وقت وادی میں ایک زور کی آندھی چلی۔ آس پاس کے چیڑ اور دیودار کے درختوں کی ٹہنیاں زور زور سے ہلنے لگیں۔ گرد و غبار سے ننھے منھے بچوں اور خود اکبر خان کی آنکھیں دُکھنے لگ گئیں۔

"خو تم گھر جاؤ۔ ہم بھی گھر جاتا ہے"

بچوں سے یہ کہہ کر وہ نزدیک ہی بہتے ہوئے پانی کے ایک جھرنے کے کنارے جانے لگا۔ درختوں کے زرد زرد پتے گر گر کر جھرنے کے بہتے ہوئے پانی کے ساتھ بہہ رہے تھے۔ اکبر خان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا جاتا تھا۔ وہ اچانک رُک گیا اپنے گرد و پیش اور دُور تک نظریں دوڑائیں۔ پھر وہیں ایک بوڑھے چنار کے نیچے بیٹھ گیا۔ جھرنے کا صاف و شفاف پانی اس بوڑھے چنار کے نیچے سے بہہ رہا تھا۔ اکبر خان نے چلو سے ہی دو چار گھونٹ پی لئے اور پھر بہت ہی اشتیاق بھری نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ بات میں سمجھ نہ سکا۔ لیکن اتنے میں جب وادی کی ایک خوب رو لڑکی اُس کے سامنے آکر اُونچی آواز میں بولنے لگی تو مجھے کچھ شک گذرا۔

"خو تم اِدھر کو" اکبر خان کا پہلا سوال تھا۔

"ایک بات تم سے"

"کیا۔ کیا بات۔ ام سنتا ہے بولو"

کچھ دیر خاموشی

"فاطمہ۔ تم کو ہمارا قسم ہے۔ بولو"

خاموشی۔ ایک طویل خاموشی۔ اس خاموشی کو کوئی نہ توڑ سکا۔ نہ اکبر خان اور نہ ہی فاطمہ۔ پھر یک لخت آنسوں کے دو موٹے موٹے قطرے فاطمہ کی آنکھوں سے ڈھلک گئے۔ اکبر خان چونک اُٹھا۔

"کیا بات ہے فاطمہ؟"

"کچھ نہیں"

"پھر بھی۔ ام کو بولو نا"

نہ جانے لڑکی کیوں نہ بول سکی۔ وہ چپکے سے اُٹھ کر وادی میں جانے لگی۔ دیر تک اکبر خان اسے دیکھتا رہا۔ اور پھر وہ بھی اُٹھ گیا۔ وہ پہاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی وادی کی طرف آ رہی تھی۔ اور آندھی بڑھ رہی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں دو بار سرینگر بھی ہو آیا۔ واپسی پہ مجھے اکبر خان کے متعلق بوڑھے چوکیدار سے بہت کچھ معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ دوسری بار جب میں سرینگر سے لوٹا تو شام کو چوکیدار نے خود ہی بات چھیڑ دی۔

"بابو اب تو معاملہ بہت بڑھ گیا ہے"

"یعنی؟" میں نے سوال کیا

"یعنی فاطمہ کی شادی"

"لیکن فاطمہ تو ابھی چھوٹی ہے۔"

"بابو آپ نہیں جانتے۔ یہ گاؤں ہے گاؤں۔ یہاں تو چھوٹی ہی عمر میں لڑکی کی شادی ہو جاتی ہے۔ اور پھر......" یہاں آ کر بڈھا رک گیا اور اپنے بائیں ہاتھ سے ماتھا رگڑنے لگا۔

"اور کیا ــ بابا تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں کہتے ہو کہ آخر بات کیا ہے؟"

"فاطمہ بدنام ہو چکی ہے بابو ــ شریف ماں باپ کی ناک کٹ گئی۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکبر خان اُس سے محبت کرتا ہے۔ اور وہ اُسی کی ہو چکی ہے ــ" اب بوڑھا کچھ موڈ میں آ رہا تھا۔

"کیا اکبر خان سچ مچ فاطمہ سے محبت کرتا ہے؟"

"بابو۔ وہ خاک محبت کرے گا اُس سے۔ وہ تو کھیل رہا ہے۔"

"اچھا یہ تو بتاؤ یہ محبت والا قصہ تمہیں کیسے معلوم ہوا"

"کیا کہتے ہیں آپ بابو ــ ساری وادی جانتی ہے۔ اور آپ کہتے ہیں مجھے کیسے معلوم ہوا۔ وادی کے سب لوگوں نے انہیں ایک دوسرے سے ملتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھا ہے ــ میں ہی کیا کہہ رہا ہوں۔ ساری وادی کہہ رہی ہے ــ اور ذیلدار صاحب بھی تو سن چکے ہیں۔ اب فاطمہ کے ماں باپ اُنہیں کے کہنے پر اپنی لڑکی کی شادی آفتاب خان سے کرنا چاہتے ہیں ــ تیاری ہو رہی ہیں۔ آفتاب خان چاہ ہی رہا تھا اور اب موقعہ دیکھ کر جلدی سے ہاں کر ڈالی ــ"

"یہ آفتاب خان کون ہے ــ"

"وہ تو ذیلدار صاحب کا ایک خاص آدمی ہے ــ پرلے ہے جواری ــ ہزاروں روپے جوئے میں ہار چکا ہے۔ لیکن باز نہیں آتا۔ گدھے کا بچہ ــ اور پھر ذیلدار صاحب کی کبھی

کبھی کچھ خدمت کرتا ہے۔ آپ سمجھ گئے نا بابو! فاطمہ ہماری اپنی لڑکی کے برابر ہے۔ ہماری وادی کی بیٹی ہے۔ پہلگام کی بیٹی ہے۔ لیکن تقدیر میں ہی آفتاب خان لکھا تھا اور اس پر ذیلدار صاحب کی سفارش۔۔ اب ہم کر ہی کیا سکتے ہیں۔۔"؟

بوڑھے کی آنکھوں میں بار بار آنسو چھلک رہے تھے۔ اُس کی زبان سے الفاظ کچھ اِس انداز سے نکل رہے تھے۔ جیسے اُس کا دل بہت بہت اُداس ہو۔ اور جیسے وہ بہت ہی مجبوری کی حالت میں روتے روتے اپنی بیٹی کو کسی ذلیل کے ہاتھوں بیچ رہا ہو۔۔!

اُس رات بھی میں نہ سو سکا۔ رہ رہ کر عجیب عجیب سے خیالات ذہن میں سما رہے تھے۔ بوڑھا چوکیدار بھی آج خلافِ معمول بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ جیسے آج اُس کے بستر میں کسی نے کانٹے بچھا رکھے ہوں۔ میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور محسوس کر رہا تھا۔

پھر اکبر خان کچھ دن وادی سے غائب رہا۔ اِس دوران میں، میں نے کئی بار فاطمہ کو سر پر مٹکا لیے آتے اور جاتے وقت پہاڑی کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ اکبر خان ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔۔ رخساروں کی سرخی اسی طرح قایم تھی۔ بھرے بھرے جسم میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی تھی اور چنچل جیسی آنکھوں میں تو اور بھی زیادہ دلکش سمٹ آئی تھی۔!

وادی میں چہ می گوئیاں ہو رہی تھیں۔ بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ اکبر خان نے بدنامی کے ڈر سے وادی چھوڑ دی۔ کچھ کہہ رہے تھے وہ ایسا کرنے والا ہے لیکن ابھی اُس نے مستقل طور پر وادی کو نہیں چھوڑا ہے۔ کیوں کہ ابھی اُس کی بوڑھی

مال پہاڑی پر کے جھونپڑے میں ہی رہ رہی تھی۔ کوئی یہ بھی کہہ رہا تھا واپسی پر وہ فاطمہ کو بھگا کر لے جائے گا۔۔ اور پھر سارے اکبر خان کا انتظار کرنے لگے تھے ۔۔ وہ کب آئے گا۔۔ اور کیا کرے گا۔۔ میں بھی سوچ رہا تھا۔

چند دن بیت گئے۔ میں ایک دن حبیب صوفی کی دکان پر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا۔ اور کبھی کبھی بیچ میں اکبر خان کی بھی بات چھڑ جاتی تھی کہ حبیب صوفی سرگوشی کے انداز میں بول اُٹھا۔

"وہ دیکھو۔۔" اُس نے ہاتھ سے بھی اِشارا کرنا چاہا لیکن نہ کر سکا۔ میں سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔ اکبر خان جا رہا تھا۔ لیکن اُس کے قدم ٹھیک سے زمین پر نہیں بیٹھ رہے تھے۔ شاید زیادہ چڑھا رکھی تھی۔

"کب آیا ہے۔ اُس نے تو وادی ہی چھوڑ دی تھی۔؟"

"دو دِن ہوتے ہیں۔۔ اب نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔" حبیب صوفی نے فرن سے اپنی بہتی ہوئی ناک صاف کی۔

"اچھا پھر ملیں گے۔۔ ایک کام یاد آیا ہے۔ ذرا جلدی ہے۔" یہ کہہ کر میں اُٹھا اور اکبر خان کا تعاقب کرنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اب میرے قدم بھی زمین پر آہستہ آہستہ پڑ رہے تھے۔ تاریکی کے سائے سارے پہلگام کو اپنی اوٹ میں لینے کے انتظار میں تھے۔ اکبر خان آکاش پر پھڑپھڑاتے ہوئے کوؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جن کی کائیں کائیں پہلگام کی خاموشی کو توڑ دیتی تھی۔۔ اب جھرنا پاس ہی آ گیا تھا اکبر خان اُس بوڑھے چنار کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور جھرنے کے بہاؤ کو دیکھنے لگا شام کے دھندلے سایوں میں کوئی لڑکی اکبر خان کے جانب آ رہی تھی۔۔ وہ

چلتے چلتے اپنے دائیں بائیں اور کبھی کبھی دِل دِل پہ ہاتھ رکھے پیچھے کی طرف دیکھنے لگ جاتی ۔ جیسے کوئی باز فاختہ کا تعاقب کر رہا ہو۔ فاختہ سہمی ہوئی بھاگ رہی ہو ۔۔ وہ آئی

اور اپنا ہاتھ اکبر خان کے ہاتھوں میں دے دیا۔

"خو۔ تم آ گیا۔۔" اکبر خان کے لبوں پہ مُسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہش ۔ آہستہ" لڑکی نے اپنا ہاتھ اکبر خان کے مُنہ پہ رکھ دیا۔

"اب تمارا شادی ہے"

"لیکن یہ میری موت ہے" لڑکی آہستہ سے بولی۔

"خو تم شادی کو پسند نہیں کرتا۔؟"

"لیکن اُس کے ساتھ نہیں" لڑکی کی نگاہیں یک دم سے اکبر خان کے چہرے سے اُٹھ کر شپ شپ کرتے ہوئے جھرنے کے پانی پہ جم گئیں۔

"پھر تم کس سے شادی ۔۔۔"

خاموشی

"بولو۔ تم کو امارا قسم ہے ۔۔ بولو۔۔"

خاموشی

"خو۔ فاطمہ ام تمہارا بھائی ہے ۔ تم امارا بہن ہے۔ ام کو نہیں بولے گا ۔۔ بولو کس سے"

"رحمان سے" لڑکی بمشکل بول سکی۔

"خو۔ تم اُس کو چاہتا ہے۔" جھرنے کے شپ شپ کرتے پانی میں دلنواز قہقہے کی گونج بلند ہوئی۔

"خو تمارا شادی رحمان سے ہوگا۔ ام تمارا شادی رحمان سے بنائے گا۔ ضرور بنائے گا۔"

"لیکن آفتاب؟" الجا کی نگاہیں اوپر اُٹھیں۔

"خو تم گھر جاؤ۔ ام بھی گھر جاتا ہے۔" وہ جلدی جلدی فاطمہ سے علیحدہ ہوا اور پہاڑی کی جانب بڑھنے لگا۔

اور اُسی رات سے اُس کی اکثر راتیں جاگتے ہی گذر رہی تھیں۔ اور آدھی آدھی رات تک چراغ جلتا رہتا تھا۔

میں اور بوڑھا چوکیدار ابھی نیند کے حسین لمحات کھو بیٹھے تھے اور اُنہی لمحات میں ایک رات چوکیدار ابھی آگی سو پڑا تھا کہ دیوار پر لگے ہوئے پرانے کلاک نے بارہ بجائے۔ نیچے وادی سے قدموں کی چاپ سُنائی دی۔ میرے کمرے کی کھڑکی میں لگے ہوئے شیشوں پر دھیمی دھیمی سی روشنی پڑی۔ میں نے آہستہ سے کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ دو آدمی پہاڑی کی طرف آرہے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے کے کندھے پر بندوق لٹک رہی تھی۔ میں نے پہاڑی کی طرف دیکھا وہاں چراغ بدستور جل رہا تھا۔ اور جلدی ہی دھیمی دھیمی روشنی میں مجھے اکبر خان کا جسم حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ اور پھر چراغ بجھ گیا۔ شاید ان دو آدمیوں نے بھی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔ وہ درختوں کی اوٹ میں سے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ دونوں آدمی بمشکل نظر آرہے تھے۔ اب وہ اکبر خان کی جھونپڑی کے بہت قریب آگئے تھے۔ ایک نے دوسرے کے ہاتھ سے خاموشی کے ساتھ لالٹین لی اور لو کم کرنے لگا۔ لالٹین کی مدہم روشنی میں اس کا چہرہ بھی مدہم دکھائی

دے رہا تھا کہ اتنے میں خاموشی کو چیرتی ہوئی گولی کی صدا پہاڑی سے بلند ہوئی۔ اُس کے ہاتھ سے لالٹین چھوٹ گئی اور ایک خوف ناک کراہ کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا آدمی واپس وادی کی طرف بھاگ گیا۔ اور اسی وقت پہاڑی کی جھونپڑی سے دو سائے نیچے وادی کی طرف آ رہے تھے۔ اکبر خان اور اُس کی بوڑھی ماں۔!

تب سے بہت دن بیت گئے۔ پہلگام پر بہار آ گئی۔ بوڑھے چناروں کی ٹہنیوں پر نئی نئی کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ جھرنے کے نیلے نیلے پانی میں نکھار سا آ گیا۔ اور پورے تین مہینے کے بعد بوڑھے چوکیدار کا جوان بیٹا رحمان دولھا بن کر فاطمہ کو لانے جا رہا تھا۔ وادی کی رانی کو لانے جا رہا تھا۔!

یہ خلش کہاں سے ہوتی؟

انور کئی روز سے اس سائیکل سوار لڑکی کو ہوٹل روڈ سے گذرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ وہ نظروں میں جھکاتے تیر کی مانند آتی تھی اور تیر کی ہی مانند چلی بھی جاتی تھی۔ لیکن انور کے دِل میں ایک بہت ہی زہریلا تیر اٹک کے رہ جاتا۔ وہ دل تھام کے رہ جاتا۔ اُس کی نظروں میں ایک عجیب سی ویرانی تڑپنے لگ جاتی۔ اور پھر وہ بہت دیر تک مبہوت سا سڑک کے کنارے کھڑا رہ جاتا۔ "اُف! کتنی زہریلی لڑکی ہے۔" وہ سوچنے لگ جاتا۔ آج تک ایک نظر بھی میری طرف نہ دیکھا۔ دل توڑنے والے دیکھ کے چل۔ ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں۔ کیا تم ہمیشہ ہی مجھ سے بے خبر رہوگی۔؟ کیا تم کبھی بھی مجھ سے نہ بولوگی۔ کیا تم اور میں ہمیشہ ہی ایک دوسرے سے دور دور رہیں گے۔ کیا تم نے کبھی۔"

کوئی تانگے والا ہارن بجاتا اور اُس کے خیالات منتشر ہو جاتے۔ پھر وہ چل دیتا لیکن خیالات پھر ایک بار دھیرے دھیرے ذہن پر چھا جاتے۔ اُس لڑکی کی تصویر ہولے ہولے اُس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگ جاتی۔ اُبھر اُبھر آتی اور پھر واضح ہو جاتی۔ کندھے تک کٹے ہوئے بھورے بھورے بال۔ گردن مورنی کی طرح لچک دار۔ کنول جیسی آنکھوں میں ہلکا ہلکا خمار۔ رخسار لال لال۔ اور وہ اونچی ایڈی کی سفید سینڈل میں سے جھانکتے ہوئے گلابی گلابی ٹخنے۔ اُف کتنی

زہریلی لڑکی ہے!

دوسرے روز اس نے بھی سائیکل نکال لی اور پورے پانچ بجے ہوٹل روڈ پہ بجلی کے کھمبے کے پاس اُس لڑکی کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ لڑکی پورے پانچ بجے وہاں سے سائیکل پہ گذرتی ہے۔ آج اُس نے اپنے آپ کو بالکل تیار کیا تھا۔ آج وہ اُس سے ضرور کچھ کہے گا۔ آج وہ ضرور اُس کے پیچھے پیچھے اپنی سائیکل لگادے گا۔ اُس روز جب اُس کے پاس سائیکل نہیں تھی اور وہ اسی جگہ لڑکی کا انتظار کر رہا تھا۔ تو کتنی بار اُس کے دل نے چاہا تھا کہ کاش اُس لڑکی کی ٹکر ہو جاتی۔ وہ سائیکل سے نیچے گر پڑتی۔ سائیکل کے کیریر سے اُس کی کتابیں نیچے گر پڑتیں۔ تو اُسے کتنا اچھا موقع ملتا اُس لڑکی کے قریب آنے کا۔ اُس سے باتیں کرنے کا۔ وہ جلدی سے اُس کے پاس آکر اُسے اُٹھا دیتا۔ اُس کے کپڑے جھاڑ کر اُس سے کہتا۔ کہیں چوٹ تو نہیں آئی آپ کو۔ پھر سڑک پہ سے بکھری ہوئی کتابیں جمع کر کے اُس کے نازک ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہتا۔ یہ لیجئے آپ کی کتابیں۔ اور پھر وہ بہت دیر تک اُس سے باتیں کرتا۔ لیکن آج جب اُس کے پاس بھی اپنی سائیکل تھی۔ اُس کے دل میں اس قسم کی کوئی بھی خواہش پیدا نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صرف یہ چاہ رہا تھا کہ لڑکی جلدی سے آئے اور وہ اُس کے پیچھے اپنی سائیکل لگادے۔ آج وہ ضرور اُس سے کچھ کہے گا۔ صاف صاف الفاظ میں کہے گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ کم از کم اُسے اپنی محبت کا احساس تو دیگا۔ ورنہ یہ روز روز صرف اُسے دیکھنا اور پھر خود کو تڑپانے سے کیا ہوتا ہے۔ عورت مرد کی طرح آنکھوں سے محبت کا سبق نہیں سمجھتی بلکہ کانوں سے۔

ٹرن ٹرن ٹرن!

اُس نے دھڑکتے ہوئے دل سے پیچھے کی طرف دیکھا۔ وہی لڑکی تھی۔ اُس نے بجلی کے کھمبے سے سائیکل نکال لی اور جوں ہی لڑکی اُس کے پاس سے گزری اُس نے جلدی سے پیڈل گھمایا اور اُس کے پیچھے ہولیا۔!

پیڈل گھمائے جا رہے تھے۔ موڑ کاٹے جا رہے تھے۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں اور دونوں سائیکلیں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ اور اُس لڑکی کے درمیان میں اب صرف دو یا ڈھائی گز کا فاصلہ تھا۔ لیکن جانے وہ اپنے آپ میں یہ ڈھائی گز کا فاصلہ طے کرنے کی ہمّت کیوں نہ پا رہا تھا۔ کیوں اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا؟ کیوں اُسے اپنے آپ کا کچھ ہوش نہ رہا اور کیوں اُس کے دل میں بار بار یہ خواہش جاگ اُٹھتی تھی کہ بس اب ایک زور کی ٹکر ہی اس لڑکی سے ہو جائے اور وہ بے ہوش ہو کر سائیکل سے گر پڑے۔ پھر جانے کیا سوچ کر اُس نے اپنی سائیکل آہستہ کی۔ لڑکی بالکل اپنی رفتار سے جا رہی تھی۔ لیکن وہ اِس بات سے بے خبر نہیں تھی کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ یہ کون لڑکا ہے۔ مگر وہ بے خبر بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن انور اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ عورت کی فطرت ہی ہے کہ وہ پہلے پہل مرد کو اِس بات کا احساس دلاتی ہے کہ وہ اُس سے بے خبر ہے۔ نہیں تو پھر وہ مرد کے چاکِ گریبان کا تماشہ کیوں کر دیکھ سکتی تھی۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو پھر وہ سائیکل اپنی رفتار سے چلا کر اسے یہ احساس کیوں دلاتی تھی کہ وہ اُس سے بے خبر ہے۔ جب کہ اُس کا ہاتھ بار بار کیریر پہ رکھی ہوئی کتابوں پہ پڑ جاتا تھا۔ اور اِس بہانے وہ ایک ترچھی مگر اُچٹتی سی نظر اُس پہ یہ دیکھنے کے لئے ڈال رہی تھی کہ آیا وہ اُس کا تعاقب کر رہا ہے یا نہیں۔؟

اُس نے پھر اپنی سائیکل تیز کی۔ ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اب ایک ہی ہاتھ سے سائیکل چلا رہی تھی۔ اُس کی گردن میں پڑی ہوئی نائلن کی ساری ہوا میں لہرا رہی تھی۔ اور سائیکل چلاتے چلاتے اُس کی پتلی کمر خم پہ خم کھا رہی تھی۔ کمر کے یہ خم انور کو بہت ہی اچھے لگ رہے تھے۔ اُس کے دل میں ایک میٹھی میٹھی چُبھن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ اُس کے قریب ہونے لگا اور پھر بالکل اُس کے قریب جا لگا۔ لیکن ایک دم نہ جانے اُس کے جی میں کیا آیا کہ اُس کا پیڈل زور زور سے گھومنے لگا اور وہ تیر کی مانند لڑکی کو پیچھے چھوڑتا ہوا خود آگے نکل آیا۔ اُس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ دل زور زور سے بج رہا تھا۔ اُف کتنا بُزدل ہوں میں بھی۔ اس کے قریب آکر بھی اُس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اُلٹے تیز نکل کر اسے یہ احساس دیا کہ میں بُزدل ہوں۔ لڑکی کی طرح شرمیلا ہوں۔ محبت کا ایک لفظ تک زبان پر نہیں لا سکتا ہوں۔ آخر وہ کیا سوچنے لگے گی میرے متعلق؟ اُس نے ایک ترچھی نگاہ پیچھے کی طرف ڈال دی۔ لڑکی بدستور ایک ہی ہاتھ سے سائیکل چلا رہی تھی۔ اُس کے جی میں آیا کیوں نہ وہ بھی دونوں ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلائے۔ اس وقت تانگوں اور موٹروں کا رش بہت کم تھا۔ اُس کی دونوں ٹانگیں زور زور سے حرکت کرنے لگیں اور ہینڈل پر سے دونوں ہاتھ اُٹھ گئے۔ اب سائیکل بہت تیز جا رہی تھی۔ لڑکی اُس سے بہت پیچھے رہ گئی۔ موڑ کاٹتے وقت جب وہ سائیکل سے گرتے گرتے بچا تو اپنی اس حرکت کو حماقت سے تعبیر کرنے لگا۔ آخر یہ لڑکی بھی کیا سمجھے گی۔ یہی کہ میں دونوں ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلا رہا ہوں اور ہیرو بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ وہ یہی تو سمجھ رہی ہوگی کہ یہ سب کچھ میں اُسے دکھانے کے لئے کر رہا ہوں۔ یہ سوچتے ہوئے اس کے ہاتھ پھر ہینڈل پر

پڑ گئے۔ ٹانگیں آہستہ آہستہ حرکت کرنے لگیں اور سائیکل بھی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اُس نے کئی بار گردن موڑ کر لڑکی کو دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کہیں نظر نہ آئی۔ وہ حیران ہوا۔ سائیکل کو بریک دی۔ سائیکل تی کی آواز کے ساتھ رُک گئی اور وہ اُتر پڑا۔ پاس ہی ایک پان والے کی دُکان کے سامنے سائیکل کھڑی کی۔ ایک سگریٹ لی اور جوں ہی اُس نے سگریٹ کو لبوں کے ساتھ لگایا۔ اُس کی نظر سامنے پان والے کی دکان پر لگے ہوئے آئینے پر پڑ گئی۔ اُس کی آنکھیں دھنسی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ رخساروں پر کافی گرد جمی ہوئی تھی۔ ہونٹ بھی خشک اور کالے پڑ گئے تھے۔ بال بھی بکھر کر گرد آلود ہو گئے تھے۔ گردن اور ماتھے پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ اُس نے جلدی سے پتلون کی جیب سے رومال نکالا۔ گردن سے پسینہ پونچھا۔ چہرے سے گرد ہٹائی، بال ہاتھ سے ہی سنوار کر کسی حد تک اپنے خاص انداز میں رکھے اور پھر ہونٹوں پر تر زبان پھیر کر اُن کی خشکی دُور کرنے کی کوشش کی ۔۔۔ پھر اُس نے اچھی طرح آئینہ میں اپنا جائزہ لیا۔۔۔ ہاں اب ٹھیک ہے۔۔۔ اُس نے اطمینان کی سانس لی۔ اُس نے ایک بار سگریٹ پیتے ہوئے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا اور مسکرا پڑا۔ جانے اپنا خوبصورت چہرہ دیکھ کر یا لڑکی کی کوئی بات یاد کر کے؟

"رحیم چاچا!"

ایک نسوانی آواز آئی۔ انور نے گردن پھیر کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے سے وحشت سی برس رہی تھی۔ اُس کی شلوار کا ایک پائنچہ پھٹ چکا تھا۔ سائیکل کا پہیہ کود اُتر چکا تھا اور ہینڈل ٹیڑھا ہو گیا تھا۔

"رحیم چاچا۔ یہ سائیکل میرے گھر بھیج دینا۔ میں دوائی لگانے نکڑ پر کے ڈاکٹر کے

پاس جاتی ہوں۔"
"اُف، یہ کیسے ہو گیا بیٹی۔" پان والے نے اُس کے ٹخنے پر آتے ہوئے زخم پر نظر ڈال کر کہا۔
"بس ذرا سائیکل سے گر پڑی۔ معمولی سی چوٹ آئی ہے۔"
وہ زخم پر رومال رکھ کر اُس کا خون بند کرنے لگی۔
"اوہ بڑی چوٹ آئی ہے آپ کو۔"
انور نے جرأت سے کام لے کر پُر درد لہجے میں کہا۔
لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔
"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس آتا ہوں۔ چوٹ زیادہ تو نہیں آئی۔؟"
اب کی بار بھی لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور جانے لگی۔ انور نے بھی سائیکل نکال لی اور اُس کے ساتھ ہو لیا۔
"آپ زخم پر پٹی باندھ دیجئے۔ یہ لیجئے رومال" انور نے جھٹ سے جیب سے رومال نکال لیا۔
"نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے"
لڑکی نے بے رُخی سے جواب دیا۔
"نہیں یہ خرابی بھی تو۔"
"کسی میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں آپ"
لڑکی کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بہت مذاقیہ ہیں آپ۔"

"شکریہ!"

یہ دوسرا طنز تھا۔

"اور کہیں چوٹ تو نہیں آئی۔"

"نہیں۔۔ لیکن یہ سب کچھ تو آپ ہی کی وجہ سے ہوا۔"

انور بھونچکا سا رہ گیا۔

"میری وجہ سے۔۔؟"

"جی ہاں آپ کی وجہ سے۔ اگر آپ میرا پیچھا نہ کرتے تو میری یہ حالت نہ ہوتی۔ آخر آپ روز روز مجھے تنگ کیوں کرتے ہیں۔ کیا آپ نے مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھ لیا ہے۔ کیا شرافت سے نہیں چلا جاتا آپ سے۔۔ آخر اس کا مقصد۔۔؟"

غصے سے لڑکی کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی ناچنے لگی۔ اس کے رخسار بھی تمتما اٹھے اور سانس کی رفتار بھی بڑھ رہی تھی۔ انور پہلے دم بخود سا ہو گیا۔ لیکن پھر جلد ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور سوچا۔ کیوں نہ آج وہ اس سے صاف صاف ہی دل کی بات کہے۔ پھر دوبارہ کہاں موقع آتا ہے۔۔ وہ ڈاکٹر سے دوا لگوا کر اپنے گھر جائے گی۔۔ اور پھر اس کی حیثیت اور بھی مضحکہ خیز بن جائے گی۔۔ اور پھر اس وقت تو موقع ہے بات کرنے کا۔۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ اس کا پارہ چڑھ جائے گا اور کیا ہوگا۔۔ وہ اسے مار تو نہ ڈالے گی! سر بازار سینڈل تو نہیں اٹھا سکتی!

"مقصد۔۔ مقصد تو صاف ظاہر ہے"

"کیا مطلب۔۔؟"

آنکھوں کے دو کنول اوپر کو اٹھے

"مطلب یہ کہ میں آپ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں آج آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ میں آپ کو دل سے چاہتا ہوں اور ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔"

لڑکی رک گئی۔ اور نظریں نیچے کئے کہنے لگی۔

"دیکھیے۔ سڑک پر ایسی باتیں کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔ آپ نہیں دیکھتے کہ۔!"

"پھر کہاں۔ پھر کہاں پر آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیونکہ ڈاکٹر کی دکان سامنے تھی۔ وہ دکان میں داخل ہوئی۔ انور نے بھی سائیکل ایک طرف کو کھڑی کی اور دکان کے اندر چلا آیا۔ ڈاکٹر دوائی لگانے کے بعد زخم پر پٹی باندھنے لگا اور جب وہ پٹی باندھ چکا تو انور پر ایک نظر ڈال کر کہا۔

"ہاں۔ فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"جی۔ میں۔ مجھے سر درد کی ایک ٹکیہ چاہیے"

لڑکی اس وقت تک دکان سے باہر آ گئی تھی۔ انور نے جلدی جلدی دوانی ڈاکٹر کو دی اور باہر آ گیا۔ یوں ہی بے مقصد سائیکل کی گھنٹی بجائی اور لڑکی کے قریب آیا۔

"جی آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا!"

"آپ کی بات کا۔ کس بات کا؟"

لڑکی نے حیرت سے ایک اور بار نظریں اوپر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا!

" اُف یہ فانی لگا ہیں ــــ اُوہ میرا مطلب تھا کہ آپ نے ابھی کہا کہ سڑک پر ایسی باتیں نہیں کرتے تو ــ پھر آپ ہی بتائیے نا میں آپ سے کہاں بات کر سکتا ہوں ــ ؟"

" آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ؟"

" جی وہ سڑک پر کیسے کہہ سکتا ہوں"

" پھر کہاں ــ ؟"

" ہوٹل سامنے ہے ۔ کیا آپ دو منٹ بھی"

وہ دونوں ہوٹل کی طرف چلنے لگے ۔ لڑکی نظریں نیچی کئے ہوئے چل رہی تھی اور انور جانے دل ہی دل میں کیا کیا سوچ رہا تھا ــــ اور سوچ سوچ کے خوش ہو رہا تھا ۔ اُسے اتنی جلدی اپنی کامیابی پر یقین نہیں آرہا تھا ۔ وہ بار بار لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا کہیں وہ سپنا تو نہیں دیکھ رہا ہے ــ ؟"

" یہ رہا ہوٹل ــ"

لڑکی نے توجہ دلائی ۔

" ہاں ۔ ہاں چلیئے ــ"

انور نے پیار بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا ۔ اور دونوں ہوٹل میں داخل ہوئے ــ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے انور کا بازو اُس کے بازو کے ساتھ مَس ہو گیا اور اُس کے سراپا میں ایک میٹھی میٹھی سی لہر دوڑ گئی ــ

" ہاں تو فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں ؟"

لڑکی نے کرسی پر بیٹھتے ہی اُس سے سوال کیا ۔

" آپ مجھے جانتی ہیں ؟"

"جی جانتی تو نہیں ۔ البتہ آپ کو کئی بار دیکھا ضرور تھے"
"مجھے انور کہتے ہیں"
" آپ مطلب کی طرف آئیے"
لڑکی نے ۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ۔ اور اِس سے پہلے کہ وہ اس کی بات کا جواب دیتا اُس نے بیرے کو اپنی طرف آتے دیکھ کر کہا ۔
"پہلے ایک کپ چائے تو ہو جائے "
"جی میں چائے نہیں پیتی"
"پھر کیا دودھ پیتی ہیں آپ ؟"
لڑکی مسکرادی ۔
"جی نہیں ۔۔۔"
"لیمن ؟"
"جی نہیں ۔۔۔"
پھر تو ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس ہوا ۔
"شکریہ !"
"ہاں بوائے پہلے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس لاؤ "
اور بیرا چلا گیا ۔
"ہاں کیا کہنا چاہتے تھے آپ ۔۔؟"
لڑکی نے پھر اپنا سوال دہرایا ۔
"جی میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں آپ سے دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں ۔

میری زندگی میں آپ پہلی لڑکی آئی ہیں جسے دیکھ کر مجھے اپنے دل پہ قابو نہیں رہتا۔ جب ہی تو آپ سے صاف صاف کہہ دیا"

لڑکی خاموشی سے سن رہی تھی۔ اتنے میں بیرا پانی کے دو گلاس لے آیا۔ دونوں نے غٹاغٹ گلاس خالی کر دئے۔ اچانک لڑکی کی نگاہیں اپنے ہاتھوں پہ پڑ گئیں جن پہ کافی میل جم گئی تھی۔

"میں ذرا نیچے ہاتھ دھو کے آتی ہوں"

یہ کہہ کر وہ اٹھی اور نیچے اتر گئی۔

انور نے جیب سے سگریٹ کی ڈبیہ نکال لی۔ دیا سلائی جلائی۔ اور دھویں کے مرغولے چھوڑنے لگا۔ وہ زور زور سے سگریٹ کے کش لینے لگا اور سوچنے لگا۔ کہیں وہ بھاگ تو نہیں گئی۔ وہ وہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پھر تو وہ پہلے ہی میرے ساتھ آنے سے انکار کرتی۔ پھر اس نے اتنی دیر کیوں لگائی۔!

اتنے میں لڑکی بھی نیچے سے آ گئی اور انور کی جان میں جان آ ئی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا۔ کیوں کہ یہ اس کے پاس سب سے بڑا ہتھیار تھا عورت کو قابو کرنے کا۔ لڑکی نے بھی اس کی مسکراہٹ کا جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے دیا اور بیٹھ گئی۔!

"تو پھر کل آپ مجھے کہاں ملیں گی؟"

"جہاں آپ کہیں! اسی ہوٹل میں"

"کس وقت۔؟"

"پانچ بجے کے بعد!

"ٹھیک ہے۔"

یہ کہہ کر انور ایک بار پھر اس پر مسکراہٹ کا سحر پھونکنے لگا۔ اور آہستہ سے اس کے سرخ و سفید ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

"معاف کیجیئے، میں تو آپ کا نام ہی پوچھنا بھول گیا۔"

"زہرا۔"

"زہرا۔۔! زہرا۔ کتنا پیارا۔۔!"

بات اس کے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔ سامنے سے سرخ پگڑیاں باندھے دو سپاہی اُن ہی کی ٹیبل کی طرف آرہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"آپ ہی مس زہرا ہیں؟"

ایک سپاہی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"آپ ہی نے ابھی ابھی ہمیں اس ہوٹل سے فون کیا تھا۔؟"

"جی۔!"

نیل کنول مُسکائے

کہانی 'نیل کنول مسکائے' کی کہانی

مُصنّف نے کہانی لکھی۔

کاتب نے کتابت کی۔

اور نہ صرف ترتیب میں اِس کا نام آیا بلکہ اِسی کہانی کا عنوان تک کتاب کا نام بھی قرار پایا۔

لیکن!

جب کتاب پریس کو جارہی تھی۔ تو کہا گیا۔

"خبردار! جو یہ کہانی شایع ہوئی!"

——— آخری الفاظ مُصنّف کے اپنے ہی الفاظ تھے!

—— کشمیر کے اُبھرتے ہوئے فن کار

—— اور آپ کے محبوب افسانہ نگار

محمود حسین بدخشی

کی شاہکار کہانیوں کا دوسرا شاہکار مجموعہ

شعلے اور شگوفے

اِدارہٴ ادبیات اُردو

خیریت آباد۔ حیدرآباد

نرم نرم کومل دھوپ !

جھلکتی چھلکتی گنگناتی ندیوں !

ـــ اُمڈ اُمڈتی گھٹاؤں کے دیس کشمیر کے افسانہ نگار

مخمور حسین بدخشی

کا پہلا شاہکار ناول

ایک روپ ہزار سائے

ایک روپ ہزار سائے ـــ آپ کے اپنے دل کی دھڑکن !

ایک روپ ہزار سائے ـــ آپ کے اپنے احساسات و جذبات کی تصویر !

(زیرِ ترتیب)

ادارۂ ادبیاتِ اردو

خیریت آباد۔ حیدرآباد